Women Writers'
Classics

افسانے

کوری ہانڈی

امرتا پریتم

RHOTAS LPS
Low Priced Series

کوری ہانڈی

افسانے

امرتا پریتم

روہتاس بکس

جملہ حقوق محفوظ

اشاعت اول	1992ء
پرنٹرز	نفیس پرنٹرز پٹیالہ گراؤنڈ لاہور
پبلشرز	روہتاس بکس احمد چیمبر 5 - ٹیمپل روڈ لاہور

Rs. 18/=

کوری ھانڈی

ترتیب

کوری ھانڈی 5
تیسری عورت 13
وہ آدمی 19
اور ندی بہتی رہی 31
یہ کہانی نہیں 37
اپنا اپنا فرض 47
وہ دوسرا 60
اجنبی اندھیرا 67
اور دیا جلتا رہا 74
سات سو بیس قدم 78
ایک گیت کا جنم 88

کوری ہانڈی

ہمارے باپو دلے کمہار کے صحن میں روزانہ سوئمبر رچایا جاتا تھا، مگر اس سوئمبر کا طریقہ ہی جدا تھا۔

خوش نما گھڑے، بانکی صراحیاں، پیارے مٹکے اور خوب پکی ہوئی ہانڈیاں بن سنور کر کھڑی ہو جاتیں---- ہمارا باپو صحن میں چارپائی ڈال دیتا اور اس پر بیٹھ کر حقہ گڑگڑایا کرتا اور ہر آنے جانے والے پر اس کی نگاہیں جمی رہتیں، اور ہمارے ہر چاہنے والے کو اس کی ایک شرط ماننی پڑتی تھی----

ایک دن بارہ سال کا ایک لڑکا آیا۔ اس نے سب ہانڈیوں میں سے مجھے جلدی سے اٹھا لیا۔ ایک بار مجھ کو ٹھوکا، گھمایا اور پھر دروازے سے باہر دیکھنے لگا مجھے یہ سلونا سا لڑکا بہت اچھا لگا اور میرا جی چاہا کہ میں جلدی سے اس کے گلے میں جے مالا ڈال دوں۔ مگر مجھے سوئمبر کی شرط اچھی طرح معلوم تھی...... پہلے وہ مجھے اٹھا کر میرے باپو کے پاس لے جائے گا اور میرا باپو جو شرط پیش کرے گا، اس کا فرض ہو گا کہ وہ اس کی تکمیل کرے۔

اسی وقت ایک عورت آواز دیتی ہوئی اندر آئی۔

"ارے منکا! تو ادھر کہاں چلا آیا؟"

مجھے معلوم ہو گیا کہ اس سلونے من موہن کا نام منکا ہے اور وہ اجنبی عورت اس کی ماں ہے۔ کیونکہ لڑکے نے فوراً ہی جواب دیا۔

"ماں! تم بھول گئیں؟ آج ہانڈی نہیں خریدو گی کیا؟"

پھر منکا مجھے اٹھا کر میرے باپو کی چارپائی کے پاس لے گیا تو باپو نے اپنی شرط

بتا دی۔

"تین آنے۔!"

منکے کی ماں جب اپنے پلو سے پیسے کھول کر گن رہی تھی تو میں سوچنے لگی کہ اب میرے جسم سے دال کی مہک آئے گی۔ میرے اندر سے چاول کی خوشبو نکلے گی اور میرا کنوارا پن ختم ہو جائے گا۔ میری یکسوئی دور ہو جائے گی اور میں ایک بھرے پرے گھر میں چلی جاؤں گی میرا منکا مجھے کھرچ کھرچ کر کھائے گا۔ اور میرے منکے کی ماں مجھے مانجھن سے رگڑ رگڑ کر صاف کیا کرے گی۔

یکایک میرے نازک تصورات کے قدم لڑکھڑا گئے...... منکا کی ماں کہہ رہی تھی۔ "منکے ہانڈی تو ہمیں لینی تھی' لیکن ابھی میرے پاس صرف تین آنے ہیں۔ کاہے کی دال خریدوں گی اور کاہے کا نمک مرچ لوں گی؟"

"لیکن ماں! ہانڈی نہیں لو گی تو دال کس میں پکاؤ گی؟" میرے منکے نے انصاف کی ایک بات کہی۔

ماں لمحہ بھر خاموش رہی پھر بولی۔

"آج دال نہیں پکے گی۔ دو آنے کا گڑ لے لوں گی' اسی سے روٹی چل جائے گی۔"

میرے منکے نے ایک بار میری جانب دیکھا اور ایک نظر دروازے سے باہر ڈالی...... مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرا منکا پرتھوری راج چوہان ہے اور میں سنجوگتا ہوں...... جیسے اب وہ مجھے اپنی بانہوں میں جکڑ کر راگوں کے گھوڑے کو ایڑ لگانے والا ہو......

"ہانڈی پرے رکھ دے اور گھر چل!" منکے کی ماں نے کہا۔

اور جب منکا نے مجھے للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کچھ کہنا چاہا تو اسی وقت پیسے کے نشے میں مست ایک آدمی نے تین آنے میرے باپو کی چارپائی پر اچھال دیئے اور مجھے منکا کے ہاتھوں سے جھپٹ کر چلتا بنا۔

"ہائے یہ کیسا سوئمبر تھا"۔۔۔۔ میرے اندر سے چیخ نکل پڑی اور مجھے لگا کہ

کسی ظالم بادشاہ نے روپے کے بھاری لشکر سے حملہ کرکے میرے منکے کو شکست دے دی ہو' اور مجھے زبردستی اپنے محل میں ڈالنے جا رہا ہو۔

"ان محل والوں کو ہم ہانڈیوں کیا ضرورت آپڑی؟"

میں حیران تھی۔ مجھے ایک محل نما مکان میں لایا گیا تو میرا دل کانپ اٹھا۔ کسی نے مجھ پر سیاہ رنگ پوت دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے میری پیٹھ پر بھوتنی کی شکل بنا دی اور میرے پیٹ میں ایک ڈنڈا لگا کر مجھے زیر تعمیر مکان کے اوپر لٹکا دیا۔

"بجر بٹو!" ---- صرف اس لئے کہ اس خوب صورت مکان یا محل کو کسی کی نظر نہ لگ جائے!

ایک بے رحم قہقہہ میرے چاروں طرف گونج اٹھا۔

پہلے مجھے اپنے حال پر رونا آیا کہ میں جو کسی چوکے کی زینت بننے والی تھی' وہ بجر بٹو بن کر رہ گئی...... اور پھر مجھے اس کے مکینوں پر رونا آیا' جنہیں اپنے پڑوسیوں کی انسانیت پر بھی شبہ تھا کہ وہ لوگ اس گھر کی شان و شوکت کو ایک آنکھ نہ دیکھ سکیں گے یہ تو پڑوسیوں اور راہ گیروں کی سخت توہین تھی۔

میں سوچنے لگی کہ جو لوگ حلال روزی حاصل کرتے ہیں اور آپس میں بانٹ کر کھاتے ہیں' اور خود زندہ رہتے ہیں اور دوسروں کو زندہ رہنے کا حق دیتے ہیں' ان کے دلوں میں اس قسم کا اندیشہ پیدا ہی نہیں ہوتا۔ کیونکہ محنت کی کمائی کو کبھی نظر نہیں لگتی۔ تو پھر یہ کیسی کمائی تھی؟ کس قسم کے پیسے کا یہ مکان تھا؟ جسے ہر لمحہ نظر لگ جانے کا خدشہ تھا' جسے ہر گھڑی انسان کی نیت پر شبہ ہوتا رہتا تھا؟

قریب سے گزرنے والے اس مکان کو خوب اچھی طرح دیکھتے۔ ایک ایک چیز کی تعریف کرتے۔ لیکن مجھ سے آنکھیں چرا کر گزر جاتے تھے۔

دوسرے دن میں نے دیکھا کہ سڑک پار کی جھونپڑی سے ایک لڑکا دوڑتا ہوا آیا۔ پہلے اس نے مکان کے باہر کھڑے ہوئے دربان کو دیکھا۔ پھر سر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ میں نے فوراً" پہچان لیا کہ وہ میرا منکا' میرا محبوب تھا۔

اس نے دوبارہ دربان کی طرف دیکھا تو اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ کیونکہ

یہی دربان اس روز مجھے اس کے ہاتھوں سے چھین کر یہاں لایا تھا۔

اس نے میری جانب دیکھا تو اس کا دل رو پڑا۔ کیونکہ مجھے ہانڈی سے بھوتنی بنا دیا گیا تھا۔

اور جب میرے منکے کی مٹھیاں بھنچ گئیں تو مجھے یوں محسوس ہوا کہ اب وہ دن دور نہیں جب میرا منکا مجھے بھوتنی کی گھناؤنی زندگی سے نجات دلا کر پھر ہانڈی بنا لے گا..... اور تب میرے جسم سے دال کی خوشبو آئے گی...... میرے اندر سے چاولوں کی مہک نکلے گی۔

پھر اس گھر میں روز نیا سامان آنے لگا۔ چاندنیاں' غالیچے' میزیں' کرسیاں' پلنگ' ریڈیو' ریفریجریٹر' مالک کی بیوی' مالک کے بچے' اس کا دفتر' دفتر کا عملہ ..... اور نہ جانے کیا کیا.....

پھر ایک روز ایک بھولی بھالی بانکی سی ایک لڑکی آئی!

اس کو دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہوا کہ یہ بھی ایک کوری ہانڈی ہے۔

اور اس تصور سے میرا دل کانپ اٹھا۔

کیا یہ بھی اپنے گھر سے نکل کر اس مکان میں پہنچتے ہی۔ میری طرح ایک روز بھوتنی بنا دی جائے گی؟..... ایک کالی کلوٹی ہانڈی.... بجر بٹو!

سب سے نیچے والے کمرے سے مجھے اس کی آواز صاف سنائی دیا کرتی تھی' وہ دن بھر ایک مشین کے سامنے بیٹھ کر ٹک ٹک کیا کرتی۔ سب لوگ اس کو مس داس کہہ کر پکارا کرتے تھے۔

ایک روز میں نے دیکھا کہ وہ لڑکی اس مکان کی بالائی منزل پر آئی' جہاں میں ایک ڈنڈے کے سہارے لٹکی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ ایک خوبرو نوجوان بھی تھا۔ جس سے وہ بہت ہی انکساری کے ساتھ کہنے لگی۔

"پریم! تم میرے دفتر نہ آیا کرو!"

"کیوں؟ میرے آنے سے دفتر کے کام میں کوئی رکاوٹ تو نہیں ہوتی۔ میں تو ہمیشہ لنچ ٹائم میں آتا ہوں۔"

"میں تمہیں کیسے سمجھاؤں کہ یہ بھی مناسب وقت نہیں ہے۔"
"تم صاف صاف کیوں نہیں بتا دیتیں کملا!...... کیا تمہارے دل میں میرے لئے اب جگہ نہیں رہی؟"
"پریم! تم سے مجھے کوئی اگلے جنم میں بھی جدا نہیں کر سکتا!"
"تو پھر بات کیا ہے؟"
"دراصل میرے باس کو تمہارا یہاں آنا جانا پسند نہیں ہے۔"
"مگر تمہارے باس کو صرف چھ گھنٹے کی ڈیوٹی ہی چاہئے یا کچھ اور.....؟"
"باس' باس ہوتا ہے پریم! اس کے حکم کے مطابق عمل کرنا ہی پڑتا ہے اور وہ مجھ پر بہت مہربان ہے' اس نے اگلے ماہ سے میری تنخواہ بڑھا دی ہے---- ایک دفتر میں میرے بھائی کے لئے سفارش کر دی ہے اور مجھ سے یہ بھی کہہ دیا ہے کہ جتنے دن میں اس کے ساتھ دورے پر جاؤں گی' اتنے دن کی تنخواہ مجھے دوگنی ملے گی۔!"
"تو گویا اب تم اس کے ساتھ شہر سے باہر بھی جایا کرو گی؟"
"ہاں پریم! جانا تو پڑے گا ہی---- باس کے تمام خطوط میں ہی ٹائپ کرتی ہوں میں ہی----"
"کملا! مجھے یہ ملازمت پسند نہیں ہے----" "مگر اس کے بغیر کام کیسے چلے گا؟ بڑی مشکل سے تو یہ ملازمت ملی ہے۔ تم تو خود ہی کہا کرتے تھے۔ کہ کوئی نوکری کر لو!"
"لیکن اگر نوکری بچ گئی تو تم نہیں بچو گی کملا!"
"ہش"......
میں نے پکار کر کہا۔ "مس داس! مس داس! تجھے یہ معلوم نہیں کہ تیرا یہ باس کوری ہانڈی کو بھوتنی بھی بنا سکتا ہے۔ ایک کالی کلوٹی ہانڈی---- بجر بٹو! ایک نظر میری جانب تو ڈالو۔"
مگر میری طرف کملا کی پشت تھی۔ سو اس نے گھوم کر بھی نہ دیکھا۔ کملا کے

کانوں میں باس کے دیئے ہوئے نوٹ بھرے ہوئے تھے۔ اس لئے اس نے میری ایک بھی نہ سنی۔

تیسرے دن باس جب اپنی بڑی کار میں بیٹھ کر دورے پر روانہ ہوا' تو مس داس بھی اس کی کار میں بیٹھی ہوئی تھی۔ مس کملا داس!..... میرا دل لرز اٹھا.....

اور جب ایک ہفتے کے بعد مالک واپس لوٹا' تو میں نے کار سے اترتی ہوئی مس داس کا چہرہ دیکھا---- وہ ہو بہو میری ہی طرح بجر بٹو سی نظر آرہی تھی۔

مس داس گاڑی سے اتر کر بالائی منزل پر آگئی۔ شاید وہ بہت گھبرائی ہوئی تھی۔ دفتر میں نہ جا سکی اور میرے قریب منڈیر پر بیٹھ کر رونے لگی۔

ہم دونوں رونے لگیں!

یکایک پورے گھر میں کہرام سا مچ گیا۔ پولیس نے مکان کو چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ باس کو ہتھکڑی لگ گئی اور عورتوں اور بچوں کو نہ جانے کہاں بھیج دیا گیا---- پولیس نے دفتر کے سارے عملے کو نکال باہر کیا اور دروازے پر بڑا سا تالا ڈال کر اس پر سرکاری مہر لگا دی۔!

میں نے لوگوں کو کہتے ہوئے سنا کہ مالک نے بہت بڑا سرکاری غبن کیا تھا!

کئی دن گزر گئے۔!

کئی راتیں بیت گئیں!"

پھر سرکاری تالا کھولا گیا۔ مکان کے اندر سے تمام چیزیں باہر نکالی گئیں اور پھر ان کو نیلام کیا جانے لگا۔

چاندنیاں' غالیچے' پلنگ' الماریاں' میزیں' کرسیاں' ریڈیو' ریفریجریٹر.... سب چیزیں اپنی جگہ سے ہٹ گئیں۔ صرف ایک چیز اپنی جگہ پر قائم رہی---- وہ میں تھی..... ایک کالی کلوٹی ہانڈی ..... بجر بٹو!

ایک رات بہت ہی نرم نرم انگلیاں میرے جسم سے چھو گئیں..... چھوٹی چھوٹی..... ٹھنڈی ٹھنڈی انگلیاں..... اور میں نے حیران ہو کر دیکھا تو میرا منکا بہت ہی آہستگی سے' بہت ہی احتیاط سے مجھے قید سے آزاد کرا رہا تھا---- نہ جانے وہ

کون سے راستے سے یہاں تک آیا تھا۔ کس کس کی نگاہیں بچا کر مجھ تک پہنچا تھا....

اور پھر' میرے ذہن میں' مس داس کی یاد آئی۔ اور میں سوچنے لگی کہ شاید اس وقت اس کا محبوب بھی اسے اپنی بانہوں میں لے کر تسلی دے رہا ہو گا۔

میرا منکا جب مجھے بغل میں دبا کر ساتھ والے مکان کی منڈیر پھاند کر اور اس کی سیڑھیوں سے اتر کر اپنے جھونپڑے میں پہنچا تو اس کی ماں جاگ اٹھی اور اس نے گھبرا کر کہا۔

"یہ کیا ہے منکے؟"

"ماں تو پڑوسیوں سے مانگی ہوئی ہانڈی لوٹا دے۔ یہ میری ہانڈی تھی۔ جو میں لے آیا ہوں۔"

"ارے' یہ تو بجر بٹو ہے۔"

"ابھی میں اسے مانجھ کر ہانڈی بنا دیتا ہوں۔"

"لیکن اس پر تو جادو ٹونا کیا گیا ہے۔"

"میں ابھی اس کا جادو ٹونا اتارے دیتا ہوں ماں' تو فکر نہ کر۔ یہ تو صرف سیاہی پوت رکھی ہے اس پر..... میں ساری سیاہی صاف کر ڈالوں گا۔"

"یہ بری بات ہے منکے!---- اگر اس میں پکائی ہوئی دال کھانے سے تجھے کچھ ہو گیا تو؟"

میں منکے کے ہاتھ سے لڑھک کر ماں کے قدموں میں چلی گئی اور بولی۔

"نہیں ماں! مجھ میں پکی ہوئی دال کھانے سے منکے کو کچھ نہیں ہو گا۔ میں پاپ کی ہانڈی نہیں ہوں۔ میں تو کوری ہانڈی ہوں۔ یہ کالکھ میں نے اپنے چہرے پر خود نہیں لگائی۔ ایک ظالم نے لگا دی تھی۔"

ماں نے نہ جانے میری بات سنی یا نہیں' مگر اس نے منکے کی بات مان لی اور اس کے ساتھ مل کر اپنے چہرے سے سیاہی صاف کرنے لگی۔ پھر مجھے مس داس کی بات یاد آئی۔ اور میں نے سوچا کہ شاید اس کا پریم بھی محبت کے پانی سے اس کے

دامن پر لگی ہوئی سیاہی کو دھو رہا ہو گا۔

اب میرا حلیہ ہی بدل گیا تھا۔ گویا میرا نیا جنم ہوا۔ ادھر صبح کی کرن پھوٹی' اور ادھر میرے اندر سے چاولوں کی خوشبو نکل کر ہر سو پھیلنے لگی۔ آج میں امیروں کے محلوں کا بجر بٹو نہیں تھی۔ آج میں ایک مفلس کے چوکے کی زینت تھی.....

ایک بار مجھے پھر مس داس کی یاد آئی۔

اسی وقت جھونپڑے کے باہر گزرنے والوں کو دیکھ کر مجھے لگا کہ وہ سب مس داس کے بارے میں چہ میگوئیاں کر رہے ہیں۔ میں پریشان ہو اٹھی.....

پھر ایک آدمی جھونپڑے میں داخل ہوا۔

"منکے! تم نے سنا کہ نہیں؟"

"کیا؟"

"ارے سامنے والے نئے مکان میں جو لڑکی آیا کرتی تھی نا' اس نے آج کنوئیں میں چھلانگ لگا کر خودکشی کرلی....."

"کونسی لڑکی؟"

میرے منکے نے کچھ نہیں سمجھا' مگر میں سب کچھ سمجھ گئی..... سب کچھ..... کہ آج ایک بڑی خوبصورت سی ہانڈی صرف اس لئے ٹوٹ گئی کہ سماج کے دل میں محبت کا ایسا پانی تھا ہی نہیں کہ جس سے وہ اس کوری ہانڈی کی سیاہی کو صاف کر دیتا..... اسے دھو ڈالتا ..... پونچھ لیتا ...... اسے سنوار لیتا ..... اور پھر اس کو کسی مقدس چوکے کی زینت بنا لیتا!!!

❀❀❀

تیسری عورت

جنازے گھروں سے باہر نکلتے ہیں، لیکن مینا جب اپنے میکے لوٹی تو سب کو یوں محسوس ہوا جیسے ایک جنازہ گھر کے اندر آگیا ہو----

سرکاری مہر والا خط مینا کے کفن ایسا تھا۔ اگرچہ اس خط میں مینا کی نہیں بلکہ ملک کی سرحد پر اس کے بانکے سپاہی نے مرنے کی خبر تھی۔ لیکن یہ خط پھر بھی مینا کے کفن ایسا تھا۔

بعض باتوں کا پتہ عورت کو اپنے اندر بہت پہلے سے ہو جاتا ہے۔ یہ بھی اندر سے معلوم ہونے والی باتوں میں سے ایک بات تھی، کہ اس ملک میں مرد ایک بار مرتا ہے لیکن اس کے مرجانے کے بعد عورت جتنی دیر زندہ رہتی ہے، معلوم نہیں کتنی بار مرتی ہے۔

پس مینا جنازے کی طرح جب اپنے میکے آئی تو گھر کی تمام گونگی دیواریں چیخ پڑیں-- اس لمحے انسان کچھ نہیں بول سکتا جب خدا اس کی زبان کاٹ دے۔ مینا کے ماں باپ تو جیسے پتھر کے ہو کر رہ گئے۔

مینا کا میکہ یعنی بیاہ سے پہلے اپنا گھر ایک وسیع گھر تھا۔ گھر کے ہر فرد کے پاس اپنی اپنی چھت اور اپنی اپنی دیواریں تھیں۔ چھوٹے سے چھوٹے بچے کا بھی اس گھر میں کوئی نہ کوئی اپنا گوشہ عافیت تھا۔ مینا جب لوٹی تو سیدھی اپنے کمرے میں یوں چلی گئی جیسے وہ کبھی اسکول یا کالج سے گھر لوٹتی تھی..... لیکن گھر کے کمروں کے دروازے جو شروع میں آسانی سے کھلتے اور بند ہوتے تھے۔ گزشتہ بیس برس سے بند تھے۔ اب یہ صرف بیاہ، طلاق جنم یا موت ایسے حادثات اور واقعات کے ہاتھوں

کھلتے اور بند ہوتے تھے۔ اور بوڑھے ماں باپ کبھی خشک اور کبھی تر آنکھوں سے قدرت کی یہ ستم ظریفی دیکھتے تھے۔

آج سے بیس برس پہلے جب مینا کی بڑی بہن کی شادی ہوئی تھی تو اس کے کمرے کو شادی کے حسین واقعہ نے اپنے ہاتھوں سے بند کر دیا تھا۔ دو برس کے بعد جب وہ اپنے سسرال سے میکے بچہ جننے کے لئے آئی تو بچے کے جنم نے اپنے ہاتھوں سے اس کمرے کا دروازہ کھولا تھا۔ لیکن چالیس دن کے اندر جب وہ دودھ پیتے بچے کو روتا ہوا تنہا چھوڑ گئی تو موت کے المناک حادثے نے اپنے بے رحم ہاتھوں سے اس کمرے کا دروازہ بند کر دیا تھا۔ بچے کو تو پہلے اس کے دادا لے گئے تھے لیکن جب معصوم بچے کو پالنا مشکل ہوا تو انہوں نے بچے کو ننھیال بھیج دیا' اور تقدیر نے اس بچے کے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے دوبارہ اس کمرے کو کھول دیا تھا۔

مینا کا بھائی آج سے بارہ برس پہلے جب یونیورسٹی کے ہوسٹل میں رہنے لگا تھا تو اس کا کمرہ جو عام ہاتھوں نے بند کر دیا تھا۔ پانچ برس کے بعد تقدیر نے خود اپنے ہاتھوں سے کھول دیا تھا۔ وہ یونیورسٹی کی ایک غیر مذہب کی لڑکی کو والدین سے چوری شادی کرکے گھر لے آیا تھا۔ اس طرح کمرہ کھل کر ریشمی پردوں میں لپٹ گیا' اور اس کے اندر سے چاولوں کی دیگ اور گوشت کی پکتی ہنڈیا کی طرح جوانی کے چونچلوں کی مہک آنے لگی۔ بڑی مشکل سے ایک سال گزرا ہو گا کہ اچانک کی ہوئی شادی اچانک طلاق میں تبدیل ہوگئی یوں اس کمرے کا دروازہ پھر سے بند ہوگیا۔۔۔۔ اور اب۔۔۔۔ آج سے تین برس پہلے مینا کی شادی نے جس کمرے کو بند کیا تھا۔ اس کو آج اس کی بیوگی نے اپنے ہاتھوں سے کھول دیا تھا۔

جس کمرے سے مینا ڈولی کی طرح گئی تھی اس میں اب وہ جنازے کی طرح لوٹ آئی تھی۔ بوڑھے ماں باپ ایسے مجبور اور بے بس تماشائی تھے جنہیں زندگی نے یہ سب کچھ دکھانے کے لئے ہاتھ پاؤں باندھ کر بٹھا رکھا تھا۔

مینا کا بھائی نیوی میں تھا۔ اور وہ گزشتہ دو برس سے ملک سے باہر تھا۔ مری

ہوئی بہن کا بیٹا جو اب اٹھارہ برس کا تھا۔ گزشتہ دو برسوں سے کسی دور دراز شہر کے ایک کالج میں پڑھتا تھا اور ہوسٹل میں رہتا تھا۔ گھر کے کیا کھلے اور کیا بند سب کمرے مینا کو دیکھ کر سسک پڑے اور بوڑھے باپ معلوم نہیں اور دیکھنے کی تاب نہ لائے ہوئے ان کی آنکھوں میں بند موتیا اتر آیا۔

سرکاری مہر والا خط جو ایک دن مینا کے کفن کی طرح آیا تھا۔ اس کے بعد بھی یہ سلسلہ چل نکلا لیکن ایسے جیسے کفن پر کچھ پھول ڈالے گئے ہوں' لکھا تھا' حکومت جنگ میں شہید ہونے والوں کی بیواؤں کو مدد دینا چاہتی ہے۔ اس سلسلے میں انہیں گھر بنانے کے لئے زمین اور ساتھ ہی روزگار دے گی روزگار کے سلسلے میں حکومت ان کی رائے جاننا چاہتی ہے۔ اگر وہ چاہیں تو چھوٹے منصوبوں کے لئے سرمایہ یا ملٹری اسکولوں میں ملازمت حاصل کر سکتی ہیں۔

سرکاری مہروں والے خطوط جو جنازے کے پھولوں ایسے تھے۔ مینا نے اپنے ہاتھوں میں لے کر مسل ڈالے اس کے اتھاہ اندر کا ایک حصہ یوں مر گیا تھا جیسے پھولوں کی خوشبو مر گئی ہو۔ کیا دن اور کیا رات وہ چارپائی پر ایک لاش کی طرح پڑی رہتی۔۔۔۔ مینا کا بھائی گھر سے دور تھا یعنی ملک سے باہر وہ دو چار روز کے لئے نہیں آسکتا تھا۔ البتہ مری ہوئی بہن کا بیٹا آوفاش ہوسٹل سے گھر آگیا۔

آوفاش نے زندگی میں نہ ماں نہ بہن دیکھتی تھی۔ جنم سے لے کر آج تک اس کے ساتھ کھیلنے والا کوئی اپنا نہ تھا۔ اس لئے اس نے سب رشتوں پر صرف مینا کو دیکھا تو وہ بھاگ کر مینا کے پاس آیا۔ مینا اسے گلے سے لگا کر پہلی بار کھل کر روئی جیسے برسوں بعد بادل برسیں' شاید آوفاش کو گلے لگا کر یا آوفاش کے گلے لگ کر۔

آج سے تین برس پہلے تو آوفاش ایک نوخیز لڑکا تھا۔ جس کو مینا نے اپنی گود میں لے کر بڑا کیا تھا اور وہ اب مینا سے بھی ایک ہاتھ اوپر نکل آیا تھا۔ ماں کا بنایا ہوا کھانا جو اکثر بے کار میں جاتا تھا اب وہی کھانا آوفاش اٹھا کر مینا کے پاس لے آیا اور کہا "اٹھو مینو کھانا کھائیں" تو مینا کے بدن کی بھوک پہلی بار جاگی اور اس نے

آوفاش کے ساتھ مل کر پہلی بار پیٹ بھر کر کھانا کھایا۔ مینا کی بھوک کو جگانے والی کھانے کی مہک نہیں تھی یہ تو آوفاش کے کہے ہوئے مینو لفظ کی خوشبو تھی۔

مینا زندگی میں سب کے لئے یا تو مینا تھی یا "مینا جی" لیکن آوفاش کے لئے تو شروع سے ہی وہ مینو تھی یا پھر وہ زندگی میں صرف اپنے بانکے سپاہی کے لئے مینو بنی تھی----

مینا کو مینا کہہ کر جو بلاتے تھے وہ ہمیشہ اسے عمر سے چھوٹا کر دیتے تھے اور جو اسے مینا جی کہہ کر پکارتے تھے وہ ہمیشہ اسے عمر سے بڑا کر دیتے تھے۔ یہ صرف آوفاش ہی تھا چاہے وہ اس سے دس برس چھوٹا تھا لیکن جب اس نے اپنی توتلی زبان سے اسے مینو کہا تھا۔ اس وقت اس نے اسے اپنا ہم عمر کر لیا تھا' اور جب بڑا ہو کر اسکول کے سوال سمجھتے ہوئے اس نے مینو کہا تھا تو بھی وہ اس کے برابر آکھڑا ہوا تھا۔

مینا کی جب شادی ہو گئی تو اس نے اپنے بانکے سپاہی کو ایک ہی بات کہی تھی کہ وہ اسے مینو کہہ کر بلایا کرے' اور وہ اسے اپنے آخری خط تک مینو ہی بلاتا رہا۔ اس کی موت سے مینا تو مری تھی لیکن بوڑھے اور کانپتے ہاتھوں سے سر کو سہلانے والے ماں باپ کی بیٹی مینو یا واقف کاروں' جاننے والوں اور سرکاری امداد دینے والے معاشرے کی مینا جی ابھی زندہ تھی۔ اس کے باوجود اس کے برابر والے نے جس نے اسے مینو کہنا تھا اس کی موت سے مینا مر گئی تھی۔

آوفاش نے جب اسے مینو کہا تھا تو مینا نے ایک بار چیخ کر اس کے ہونٹوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا تھا۔ لیکن پھر اپنے ہاتھ کو ایک طرف ہٹا لیا شاید اپنے کانوں سے ایک بار پھر اس لفظ کو سننے کے لئے یا شاید یہ موت کی ہچکی کی طرح ہو--

بعض باتیں جو عورت کو اپنی ذات سے معلوم ہو جاتی ہیں۔ یہ بھی ان باتوں میں سے ایک تھی کہ اس لفظ کا اب اس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رہا تھا۔ اور اس لفظ کو اب بھی اس نے اپنے ہاتھوں سے نہیں چھونا تھا۔ لیکن اس نے پھٹی پھٹی نگاہوں سے روز اسے دور سے دیکھنا شروع کر دیا تھا۔

آوفاش اس کے سامنے کھانا رکھ دیتا تو وہ کھا لیتی' آوفاش اس کے سامنے کیرم بورڈ رکھ کر بیٹھ جاتا اور دونوں کیرم بورڈ کھیلنے لگ جاتے۔ آوفاش اسے گھر کی پچھلی دیوار کے ساتھ ملحق پھلواڑی میں لے جاتا تو وہ پیڑوں کی چھاؤں میں پرچھائیں کی طرح چلتی رہتی۔ ایک طلسم روشنی کا تھا اور ایک اندھیرے کا جو آہستہ آہستہ مینا کے ارد گرد لپٹا چلا جا رہا تھا۔

آوفاش جو اب پورا ایک ہاتھ مینا کے قد سے اوپر نکل آیا تھا۔ اندھیرے کے طلسم میں اسے بالکل اپنے بانکے سپاہی کی طرح لگتا تھا۔ اور روشنی کے طلسم میں وہی آوفاش ڈھائی تین ماہ کی عمر کا ہو جاتا تھا۔ جسے مینا نے چھوٹی امی کی طرح اپنی گود کھلایا تھا۔

مرد مر جائے تو عورت کے چاہے تمام حصے زندہ رہیں لیکن اس کی کوکھ ضرور مر جاتی ہے مینا کے سر کو اپنی مردہ کوکھ کی بو چڑھنے لگی۔ اور پھر ایک حسرت یہ جاگی کہ اگر اس نے بانکے سپاہی کو اپنی کوکھ میں سنبھال لیا ہوتا تو آج اس کا ایک ٹکڑا دنیا میں زندہ رہتا۔

ہاتھ سے نکلے ہوئے لمحوں نے مینا کے بدن میں چیخنا شروع کر دیا۔

ایک دن وہ لمحہ بھی آیا جب روشنی اور اندھیرا ایک دوسرے کو گلے ملتے ہیں۔ مینا اپنے کمرے میں چارپائی پر لیٹے ہوئے آوفاش کے چہرے کو ایک ٹک دیکھے جا رہی تھی۔ اس لمحے آوفاش کے چہرے پر دو چہرے سجے ہوئے تھے۔ ایک مینا کے مرد کا چہرہ اور ایک اس مرد سے پیدا ہونے والے بچے کا چہرہ۔ مینا کو یہ بھی معلوم تھا کہ ایک چہرہ اس دنیا میں نہیں تھا۔ اور دوسرے چہرے نے اب اس دنیا میں آنا نہیں ہے۔ لیکن وہ حیران تکے جا رہی تھی کہ سامنے اسے دو پرچھائیں کیوں دکھائی دے رہے ہیں۔ اس پر ایک عجیب سے خواب کی کیفیت طاری ہو رہی تھی کہ کوئی پرچھائیں نہیں بلکہ ایک جوان ہونے والے مرد آوفاش کا چہرہ ہے۔ خواب کے ساتھ ایک حقیقت بھی تھی جس میں چھوٹے سے بچے آوفاش کا خیال بھی تھا۔ جس کے ساتھ اس کا اٹھارہ برس سے ایک رشتہ چلا آ رہا تھا۔ لیکن ایک نیند آور کیفیت

یہ بھی تھی کہ یہ جو سامنے دکھائی دے رہا ہے وہ صرف ایک مرد ہے اور وہ خود صرف اور صرف ایک عورت ہے' اس کی کوکھ اس مرد کو اور اس کی اپنی شخصیت کو چیخ چیخ کر اس سے مانگ رہی ہو۔

روشنی اور اندھیرا دونوں گھل مل گئے بالکل مینا کے دل کی کیفت کی طرح' اور اس طرح ایک عورتوں کی بانہوں نے جب آگے بڑھ کر جب ایک مرد کی دونوں بانہوں کو تھاما تو بدن سے بدن ایک مہک جاگی----

ایک عورت کے کپڑے اور ایک مرد کے کپڑے سرسرا کر چارپائی سے نیچے گر پڑے اور چارپائی کے پائیوں کے قریب سر جھکا کر گٹھری بن کر بیٹھ گئے۔ یہ ایک پرسکون روح سے روح کی لمس کا لمحہ نہیں تھا۔ یہ ایک لامحدود اور لامکانی لمحہ تھا' یہ ایک لڑکھڑاہٹ اور پھسلن کا لمحہ تھا۔ جس میں ایک عورت دل کی گہرائیوں پر پاؤں رکھ کر اپنے آپ کو ڈھونڈ رہی تھی۔ اور ایک مرد گھبراہٹ میں اپنی عمر سے بہت بڑا ہو گیا تھا۔

وجدانی اور الہامی لمحات بیتے تو مینا ایک نئی موت مر گئی تھی۔ صرف مینا نہیں مینو بھی۔

ساری رات چارپائی پر جیسے دو عورتیں تھیں اور دونوں نے ایک دوسری پر الزام دیتے ہوئے ایک دوسری کو مار ڈالا تھا۔ اور صبح جو عورت کمرے سے باہر نکلی وہ ایک تیسری عورت تھی' اور اس نے مسلے ہوئے سرکاری کاغذات پر جھٹ سے دستخط کئے اور لکھا کہ وہ بہت جلد کسی دور دراز پہاڑی علاقے کے اسکول میں نوکری کرنا چاہتی ہے۔

تھوڑے دنوں کے بعد اس گھر کا ایک کمرہ جسے ایک حادثے نے کھولا تھا اسے ایک دوسرے حادثے نے دوبارہ بند کر دیا۔ مینا دور پہاڑی علاقے کے ایک اسکول میں چلی گئی شاید ہمیشہ کے لئے۔"

وہ آدمی

بیس برس سے اسے ایک ہی خواب دکھائی دیتا تھا۔

جہاں وہ نوکری کرتا تھا۔ فرم کا مالک اس سے بہت خوش تھا اس لئے کہ وہ دفتر میں گھڑی کے ڈائل پر سوئیوں کی طرح گھومتا نہ اسے کوئی کام یاد دلانے کی ضرورت یعنی گھڑی کو چابی کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ مالک کبھی کبھی سوچتا، گھڑی تو کبھی رک بھی جاتی ہے لیکن وقت نہیں رکتا وہ زندگی کے وقت کی طرح تھا۔

دفتر کی چار دیواری سے نکلتا تو وہ سیدھا گھر کی چار دیواری میں داخل ہو جاتا اس کی بیوی خوش تھی۔ چھوٹی بڑی ضروریات کے لئے وہ جو چاہتی، جہاں سے چاہتی خرید سکتی تھی مانگ سکتی تھی۔ اور اس نے کبھی کوئی بہانہ نہیں تراشا تھا۔

چار چار دیواروں کے دو دائرے تھے چار کونوں والے احاطے کی طرح، جن میں دفتر کا مالک دن کی طرح طلوع ہوتا تھا اور گھر میں بیوی رات کی طرح آتی تھی پوشیدہ مرض کی طرح اسے ایک بات معلوم تھی کہ یہ سب کچھ ایک پرانا خواب تھا۔ پورے بیس برس اسے یہی خواب دکھائی دے رہا تھا۔ جو بل اس کے ماتھے پر نہیں پڑا تھا وہ اس کے اندر اتر گیا تھا۔ اس کے دل میں ایسے محسوس ہوتا تھا۔ جیسے وہ پرائی نیند سوتا اور پرائی نیند جاگتا ہے۔

پھر ایک سانحہ ہوا، اس کی بیوی کو ایک چھوٹے سے آپریشن کی ضرورت پڑی اچھی بھلی ہسپتال پہنچی لیکن جیتے جی گھر واپس نہ آئی۔ خدا کے ہاتھوں اس کی زندگی کا ایک دائرہ تو ٹوٹ گیا، لیکن دوسرا دائرہ باقی تھا جسے اس نے خود توڑ دیا۔ اس نے نوکری سے استعفیٰ دے دیا۔ اور اس طرح ایک ہی وقت میں چار چار دیواروں

کے دونوں دائرے ٹوٹ گئے اسے بیوی کی موت کا بس اتنا ہی دکھ تھا جتنا ایک حساس آدمی پڑوس کے گھر میں ہونے والی موت کو محسوس کرتا ہے۔ یا اخبار میں کسی اجنبی کی موت کی خبر پڑھ کر گھڑی پل کے لئے اداس ہو کر پھر اپنی مصروفیات میں کھو جاتا ہے۔

وہ بھی مصروف ہو گیا۔

اس کی سب سے پہلی مصروفیت تو یہ تھی کہ گھر میں جو چیز بھی فالتو دکھائی دیتی وہ اسے اونے پونے میں بیچ کر جگہ خالی کر دیتا۔ ریڈیو اس کے لئے سب سے زیادہ فالتو چیز تھی۔ صرف شور و غل کا منبع۔ سب سے پہلے اس نے اس سے نجات حاصل کی۔ کُکنگ رینج نے بھی یوں ہی جگہ روک رکھی تھی۔ اس کو کچھ پکانے کے لئے صرف آگ کی ایک آنچ چاہئے تھی اور چولہے کے لئے دو اینٹیں بہت تھیں۔ فریج نے تو ایسے ہی ایک ہنگامہ کھڑا کیا ہوا تھا۔ اسے دو وقت کی سبزی اور روٹی کے لئے کچھ بھی تو بچا کر محفوظ کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ مہنگے سٹیل کے برتن بالکل فضول تھے۔ ایک توا اور ایک آدھ خالی پلیٹ' یا ایک آدھ برتن ہی کافی تھا۔ واشنگ مشین بھی تو بالکل نکمی شے تھی۔ وہ اپنی قمیص کرتہ روز اپنے ہاتھ سے دھو سکتا تھا۔ مہنگے فرنیچر کی اسے بالکل ہی ضرورت نہ تھی۔ بیٹھنے کے لئے لکڑی کا ایک تختہ اس کے لئے کافی تھا۔

بجلی' پانی' ٹیلی فون' ہاؤس ٹیکس' اور انکم ٹیکس کے بل اس نے ادا کر دیئے اور ساتھ ہی فیصلہ کر لیا کہ یہ سب آخری بل ہوں گے۔ آئندہ سے وہ ان کی ادائیگی کے لئے کسی قطار میں کھڑا نہیں ہو گا۔

اسے صرف خالی جگہ چاہئے تھی۔ اپنے بیٹھنے کے لئے' کھڑے ہونے کے لئے سونے اور جاگنے کے لئے' چیزوں نے جگہ خالی کر دی تھی۔ لیکن یہ بھی کافی نہیں تھا۔ چاروں طرف پتھر کی دیواریں تھیں اور یہ سب کچھ اس کے لئے ایک چبھن تھی۔ اسے یاد آیا۔ شروع میں جب کبھی وہ اپنی بیوی کو اپنے خواب سناتا تو اس کی بیوی کو لپنے چاروں طرف ایک گرد سی اڑتی محسوس ہوتی۔ اسے معلوم تھا کہ

اس کا خواب شہر کی تہذیبی اور پتھریلی سڑکوں پر چلنے کے قابل نہیں وہ کچے اور سیدھے سادھے راستے ڈھونڈتا تھا۔ اس لئے اس کی بیوی کو ان راہوں کی باتیں کبھی سمجھ نہ آئیں۔

بیوی کی موت اور نوکری سے استعفیٰ کے بعد وہ جی بھر کر سویا تو اسے محسوس ہوا کہ وہ اپنی نیند سویا اور اپنی نیند جاگا ہے۔ پھر ایک دن اس نے پکی سڑکوں اور مکانوں سے اپنا تعلق توڑ دیا۔ وہ ایک پہاڑی گاؤں کی کچی راہ پر چل نکلا۔ تھوڑی سی زمین خریدی اور اس پر گھانس پھونس کا ایک جھونپڑا ڈال لیا جیسے ایک شخص اپنے گلے میں قمیض پہن لیتا ہے۔ یا سردی اور برف باری سے بچنے کیلئے اپنے اردگرد چادر لپیٹ لیتا ہے۔ یہ جھونپڑا اس کے بدن کو چبھتا نہیں تھا۔ اس کے لئے دور تک پھیلی زمین اور آسمان کی وسعت تھی۔ دور جہاں تک دکھائی دیتا۔ کھیتوں سے پارندی سے دور چھوٹی بڑی پہاڑیوں سے بھی بہت آگے اسے اپنا آپ دکھائی دیتا تھا۔

اس کے ہاتھ پاؤں تھکنا چاہتے تھے۔ لیکن وہ نہیں تھکتا تھا۔ وہ اپنی چھوٹی چھوٹی کیاریوں کو اپنے ہاتھوں سے سینچتا۔ اس کی زمین کو نرم کرتا اور بیج ڈالتا۔ جیسے ایک ابدی بھید اس نے پا لیا تھا۔ جب ہاتھ پاؤں نہیں تھکتے تب دل تھک جاتا تھا۔ میں بیس برسوں کا تھکا ماندہ ہوں۔

اب میری بیس برسوں کی تھکاوٹ دور ہو جائے گی۔

آوازیں اب بھی اس کے آس پاس موجود تھیں۔ درختوں کے پتوں کی سائیں سائیں گھاس کی سرسراہٹ، بکری کی میں میں، مرغیوں کی کٹ کٹ، بہار کی آمد کے ساتھ ہی پگڈنڈیوں پر لہراتے ہوئے گیتوں کے سر، لیکن یہ آوازیں دل کی دھڑکن کی طرح تھی یا اپنی بانہوں میں ٹک ٹک کرتی نبض ایسی۔

جب کبھی اسے اپنا دفتر، گھر، مالک یا بیوی کے لئے، روٹی، چائے یا شراب کی محفلیں یاد آتیں تو وہ گھبرا جاتا اور اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتا۔ ایک نیا خواب دیکھ رہا تھا۔ جو نت نیا تھا۔ اس میں کہیں سے اڑ کر آئے پنچھی کی چہکار

تھی- جو درختوں کی شاخوں پر جھولتے نظر آتے یا مکی بھٹوں میں دمکتے ہوئے' دانے یا چائے کے پودوں پر کھلتی ہوں پتیلیاں!!!

یوں سات برس بیت گئے-

ہولے سے چپکے سے ایک دن شام ڈھلے وہ گڑ اور شہد سے روٹی کھا کر چولہے کی دہکتی آگ کے قریب بیٹھا دیئے کی لو میں معمول کی طرح کوئی کتاب پڑھ رہا تھا کہ کسی نے جھونپڑے کے دروازے کی جگہ اٹکے ہوئے لکڑی کے تختے کو زور سے تھپتھپایا-

اس نے کتاب سے سر اٹھا کر کچھ دیر تختے کی طرف دیکھا- جیسے وہ اس کے جھونپڑے کا تختہ نہ ہو' کسی اور کے گھر کا دروازہ ہو- بھلا اس کے پاس کون آئے گا؟

تختہ دوبارہ تھپتھپایا گیا- اسے سوراخوں سے گزرتی ہوئی آواز بھی سنائی دی- جسے وہ پہچان نہ سکا- اس نے اٹھ کر تختے کو ہاتھ سے اٹھا کر ایک طرف کیا سامنے ایک نوجوان کھڑا تھا- جس نے جھکتے ہوئے پوچھا- "میں ---- میں اندر آسکتا ہوں-؟"

اس نے دروازے کے ایک طرف ہو کر آنیوالے کے لئے راستہ چھوڑ دیا- آنے والے کے پاس ایک سوٹ کیس تھا اس نے اندر داخل ہو کر سوٹ کیس ایک طرف رکھدیا- بوجھ کو زمین پر رکھتے ہوئے اس نے اطمینان بھری سانس لی پہلے چولہے کی آگ کی طرف دیکھا اور پھر اس کے چہرے کی طرف اور بولا- میں اندر ہوں آپ کا چھوٹا بھائی----:

اندر ---- اسے ایک بہت پرانی اور آدھی بھولی بسری کہانی کے کردار کی طرح یہ نام یاد آیا- اور پہچان بھی-

جب اس کا باپ زندہ تھا اس نے اپنے سوتیلے بھائی اندر کو دیکھا تھا بمشکل اسکول جانے کی عمر کا تھا- تختے کو اپنی جگہ رکھ کر ایک لکڑی کے بڑے سے ٹکڑے کو چولہے کے قریب کھینچ کر اس نے اندر کو بیٹھنے کے لئے کہا- پھر کچھ پوچھنے کے

لئے اس کی طرف دیکھا لیکن باپ زندہ نہیں تھا۔ جس کے بارے میں کچھ پوچھتا۔ سوتیلی ماں نے تو ایک عرصہ سے اس سے رشتہ ناتا توڑ رکھا تھا۔ اس لئے اس کے بارے میں پوچھنے کے لئے کچھ نہ تھا۔ اندر خود ہی کہنے لگا۔ میں شہر میں آپ کے پرانے دفتر سے آپ کا پتہ پوچھ کر گاؤں سے ہوتا ہوا یہاں تک پہنچا ہوں۔

اس کے جی میں آیا کہ وہ کہے۔ کس لئے؟ لیکن گھر آئے کو یوں کہنا مناسب نہیں تھا۔ اس لئے اس نے کہا۔ کچھ کھاؤ گے روٹی، چائے؟

مجھے تو بھوک لگی ہے؟ اندر نے جھٹ سے جواب دیا۔

اس نے ایک مٹی کے گھڑے میں رکھے ہوئے آٹے کو ہاتھ سے نکال کر ایک تھالی میں گوندھا اور پھر چولہے میں نئی لکڑی ڈال کر روٹی پکا دی۔

گڑ اور شہد بھی ساتھ رکھ دیا۔ پھر اسے خیال آیا کہ صبح اس نے اپنے لئے دو انڈے ابالے تھے۔ لیکن وہ انہیں کھانا بھول گیا تھا۔ وہ ابھی تک ویسے ہی پڑے تھے۔ تب اس نے انڈے اٹھائے ان کے چھلکے اتار کر اندر کو دیئے اور چولہے پر چائے کا پانی رکھ دیا۔

اندر کو بڑی بھوک لگی ہوئی تھی۔ وہ روٹی کو جلدی جلدی کھانے لگا۔ یوں روٹی کھاتے دیکھ کر اسے اندر کچھ اچھا نہ لگا۔ لیکن ساتھ ہی اس کا دھیان اندر کے سوٹ کیس کی طرف جا پڑا۔ اسے خیال آیا کہ اب یہ رات یہاں رہے گا۔ وہ اٹھا اور اپنے بچھونے کے قریب ایک اور بچھونا ڈال دیا۔ نہ معلوم کیوں آج اسے اپنا جھونپڑا عجیب سا لگ رہا تھا۔

گرم گرم چائے کے گھونٹ بھرتے ہوئے اندر اونگھنے لگا پھر وہ چپ چاپ چائے کا خالی گلاس ایک طرف کرکے اپنے بچھونے پر لیٹ گیا۔ وہ دیر تک سوئے ہوئے اندر کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر اس نے بھی چولہے کی لکڑی باہر کھینچ کر سونے کی کوشش کی۔

صبح چولہے پر پکنے کے لئے دلیا رکھ کر بکری کا دودھ دوہتے ہوئے اس نے سوچا ناشتہ کھلا کر اسے چلتا کرے گا یا شاید وہ خود ہی چلا جائے گا؟۔

دودھ کی گھڑوی اٹھائے ہوئے اسے خیال آیا' کہتا تھا شہر میں تمہارے دفتر سے تمہارا پتہ لگایا تھا۔ اور پھر گاڑی سے اتر کر راہ میں آئے گاؤں سے بھی میرا پتہ پوچھا تھا۔ معلوم نہیں کس لئے یہاں آیا ہے اور کتنی دیر رکنے کا ارادہ ہے۔

اندر سو کر اٹھا وہ جھونپڑے سے باہر آکر دور پہاڑ کی اوٹ میں سے نکلتے سورج کو دیکھ کر خوش بھی ہوا اور حیران بھی کہیں سے بہتے پانی کی آواز آ رہی تھی۔ "کیا نزدیک کوئی ندی بہہ رہی ہے؟" اندر نے دودھ کی گھڑوی لے کر آتے ہوئے بھائی سے پوچھا۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے جواب دیا۔ ان درختوں سے پرے اندر ہرن کی طرح قلانچیں بھرتا ان درختوں کی طرف چل دیا۔

اس نے گڑ اور دودھ سے دلیا بنا کر دیگچی چولہے سے اتار لی۔ اور پھر اسی پر چائے کا پانی رکھ کر چشمے سے تازہ پانی لانے کے لئے چلا گیا۔ جب وہ پانی کا گھڑا لے کر لوٹ رہا تھا تو اسے اندر ندی سے نہا کر آتا دکھائی دیا۔ وہ بھاگ کر اس کے قریب آیا اور اس سے پانی کا گھڑا پکڑ لیا۔

رات کو یا تو طویل مسافت کی تھکاوٹ تھی یا شاید بھائی نام کے آدمی سے منسوب ایک اجنبی کو ملنے کی گھبراہٹ یا رات کے اندھیرے کی وجہ تھی۔ کہ اسے اندر شہر کا بگڑا ہوا نوجوان دکھائی دیا۔

لیکن اب ندی سے نہا کر آیا اندر اسے بہت اچھا لگا۔ شکل و صورت بھی اچھی دکھائی دینے لگی تھی۔ اور ہے اور شاید دل کا بھی برا نہ ہو۔ چولہے کے قریب بیٹھ کر آہستہ آہستہ چائے پیتے۔ تیس برس سے زیادہ گزرے وقت کے کچھ سنگریزے اس کی یادوں میں چبھ گئے۔

باپ ہمیشہ اپنے کاروبار میں مصروف رہتا تھا۔ ہمیشہ بڑھتے اور گھٹتے بھاؤ کی باتیں کیا کرتا اور افراتفری کا شکار رہتا۔ ماں آئینے کے سامنے کھڑی بالوں کو سنوارتی رہتی۔ ہر روز بازار سے خریداری کرتی اسے بچپن میں ہی ہوسٹل میں بھیج دیا گیا تھا۔ اس لئے اسے بہت عرصہ بعد معلوم ہوا کہ گھر میں ماں نام کی عورت اس کی ماں نہیں۔ ماں تو اسے جنم دیتے ہی مر گئی تھی۔ سکول اور کالج کی چھٹیوں میں

دیکھی ہوئی گھر کی کچھ پرچھائیں اس کی آنکھوں میں لہرانے لگیں اور وہ اندر کو دیکھنے لگا۔ شاید وہ اس کے چہرے پر کسی بھولی یاد کا سایہ تلاش کر رہا تھا۔

وہ یہاں کیا لینے آیا ہے؟ یہ بات وہ پوچھنا چاہتا تھا۔ لیکن اندر نہانے اور کھانا کھانے کے بعد ایک پرسکون بلی کی طرح چولہے کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ اس لئے اس سے کچھ بھی نہ پوچھ سکا۔ چولہے کی دھیمی آنچ پر ہنڈیا رکھتے ہوئے بولا! چنے کی دال کھاؤ گے نا! ہاں دل چاہے تو سامنے پہاڑی پر گھوم آنا۔ میں اتنے میں مٹروں کی کیاریوں کو دیکھ آؤں اور اگر کچھ تیار ہوئے تو پکانے کے لئے بھی لے آؤں گا۔ یہ کہہ کر وہ باہر کیاریوں کی طرف چل دیا۔ اندر بھی اس کے پیچھے چلنے لگا۔ کچھ دیر دونوں چپ چاپ چلتے رہے۔ ایک بار اندر تو امرودوں کے پیڑوں کے پاس رک گیا۔ لیکن پھر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اس کے قریب آگیا۔ جہاں وہ پودوں کو ٹٹول ٹٹول کر پکے پکے مٹروں کو توڑ رہا تھا۔

"اپنے کھیت ہیں۔" اسے اندر کی آواز سنائی دی۔ اس نے دور پہاڑوں کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ جہاں تک نظر جاتی ہے سب کچھ اپنا ہے۔ یہاں کے چشمے' ندی نالے' یہ تمام---- اندر جنگلی پھولوں کی طرح ہنس دیا۔ ادھر ادھر تو کوئی کھیت دکھائی نہیں دیا۔ جو کاشت کیا گیا ہو۔ یہ جنگل تو محکمہ جنگلات والوں کا ہوگا؟ مٹروں کی پوٹلی باندھے کیاریوں میں سے اٹھ کر کھڑے ہوتے اور جنگل کی طرف دیکھتے ہوئے وہ کہنے لگا۔ ان کا کیا ہے وردی پہنے سال میں ایک دن آتے ہیں اور درختوں پر نمبر لگا کر چلے جاتے ہیں۔ یہ سب کچھ تو میرا ہی رہتا ہے' یا پھر جنگل کے جانور!!! اور پھر وہ خود ہی جنگلی پھولوں کی طرح ہنس دیا۔

اس نے انار اور امرود کے پیڑوں کے نیچے بیٹھنے کے لئے کچھ جگہ بنا رکھی تھی۔ قریب ہی ایک طرف ڈھلوان پر ایک چھوٹا سا کھیت تھا۔ جس کی طرف دیکھتے ہوئے اندر نے پوچھا۔

"اپنا ہے نا؟"

اس نے بیٹھتے ہوئے آہستہ سے سر کو ہاں میں جنبش دی۔

بس اتنا سا، ہم تو اور بھی زیادہ، رقبہ کاشت کر سکتے ہیں؟
اس نے ایک بار پھر غور سے اندر کے چہرے کی طرف دیکھا اور کہنے لگا۔
"کس لئے؟"

"زیادہ اناج ہو گا تو منڈی لے جا کر بیچیں گے۔" اندر بولا۔
اپنے لئے تو چائے کے دو چار پودے اور سبزی کی چند بیلیں ہی کافی ہیں۔
اندر کا ابھی ابھی کہا ہوا جملہ اسے اپنے کانوں میں اٹکتا ہوا محسوس ہوا۔
زیادہ اناج ہم بیچ بھی سکتے ہیں" اس نے اپنے کانوں کو کھینچا۔ جیسے لفظ "ہم" میل کی طرح کانوں سے نکال رہا ہو۔ اندر نے بڑی لجاجت سے کہا۔ مجھے یہاں اپنے پاس رکھ لو۔

وہ وہاں سے اٹھنا چاہتا تھا۔ لیکن سنبھل کر بیٹھ گیا۔ اندر سر جھکائے کہہ رہا تھا۔ ماں بڑی دیر سے بیمار تھی۔ اس نے تمام پیسہ اپنے بھائیوں کے پاس رکھا ہوا تھا۔"

اسے یاد آیا۔ یہ اڑتی ہوئی بات اس نے بھی سنی تھی۔ کہ اس کے باپ کا سارا پیسہ سوتیلی ماں نے اپنے بھائیوں کے پاس رکھا تھا۔ تاکہ موت کے بعد اس کا سوتیلا بیٹا کچھ نہ لے سکے۔ اسے ہنسی آگئی---- اندر نے پوچھا "پھر---- انہوں نے کچھ بھی نہیں لوٹایا۔" ماں پچھلے مہینے مر گئی" اندر کا چہرہ اور سر جھکا ہوا تھا اور آواز بھی بجھ گئی تھی۔ اندر نے کہا میرے پاس رہنے کے لئے کوئی جگہ نہیں۔
یہ سن کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ چیخ کر کہنا چاہتا تھا۔ "نہیں---- نہیں---- بالکل نہیں" لیکن اس کی آواز گلے میں یوں پھنس گئی۔ جیسے کوئی دلدل میں پھنس جاتا ہے وہ بے بس کھڑا اندر کو دیکھتا رہا۔
اندر نے کہا کنور بھائی میرا اس دنیا میں اور کوئی نہیں۔
اس نے ہاتھ سے اندر کو دور ہٹانا چاہا۔ لیکن حیران ہو کر دیکھا کہ اس کا ہاتھ اندر کے کندھے پر جا کر ٹک گیا۔ جیسے وہ اپنے ہاتھ سے اسے سہلا بھی رہا ہے اور دلاسا بھی دے رہا ہے۔ سامنے ایک معصوم سا چہرہ تھا۔ آلو کی طرح پھولا پھولا سا۔

ماں کے بھائیوں سے دھوکا کھایا ہوا یا سماج کا دھتکارا ہوا اس نے اپنے ہاتھ سے اندر کے کندھے سہلاتے ہوئے کہا "اچھا" تو اس مکی کے کھیت کے قریب اپنا جھونپڑا ڈال لے۔ یہ سن کر اندر مکی کے بھٹوں کی طرح کھل اٹھا۔

دونوں نے مل کر مٹی گارا بنایا۔ نیچے گاؤں سے چھت ڈالنے کے لئے گھانس پھونس ڈھویا گیا۔ اندر کے کہنے پر گاؤں کے بڑھئی سے کمرے کا دروازہ بھی بنوایا گیا۔ لیکن وہ دل میں سوچتا رہا شہر کے بیج شہر میں ہی اگتے ہیں' پڑھا لکھا لڑکا ہے خود ہی دو چار ماہ بعد شہر لوٹ جائے گا۔

اندر کبھی کبھی شہر سے بھی ہو آتا تھا اس کے ہر بار جانے کے بعد وہ سوچتا شاید اس دفعہ اسے کوئی نوکری مل جائے گی اور وہ شہر ہی میں رہ جائے گا۔ لیکن اس کی یہ سوچ صرف ایک ایسی آرزو ہی رہتی جو کبھی پوری نہیں ہوتی اندر پانچ سات دن کے بعد دوبارہ لوٹ آتا۔

اس دوران اندر کو کبھی کبھی شہر سے چٹھیاں بھی موصول ہونے لگیں تھیں معلوم نہیں یہ کون لکھتا تھا۔ اس نے کبھی پوچھا بھی نہیں تھا۔ لیکن ڈاکئے کا یوں اچانک سر پر آکھڑا ہونا اسے اچھا نہیں لگتا تھا۔ ایک دن چٹھی آئی۔ اندر نے اس کے سامنے اسے کھولا' پڑھا تو اس کے چہرے کا رنگ مٹی ہو گیا۔ اس کے خیال میں یہ ایک ایسی چٹھی تھی۔ جس میں اندر کے کسی دوست نے اسے نوکری کی امید ختم ہونے کی اطلاع دی تھی۔ اندر کے کاشت کئے ہوئے کھیت اب کمر تک پہنچ گئے تھے۔ اندر چٹھی کو ہاتھ میں پکڑ کر کھیتوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جیسے کسی جانور نے ان کو پامال کر دیا ہو۔

اس نے درخت کی ایک شاخ کو ہاتھ سے پکڑتے ہوئے اندر کے چہرے کی طرف دیکھا' اندر بھی ڈری ڈری آنکھوں سے اسے تک رہا تھا۔ وہ اندر کے قریب آکر کھڑا ہو گیا۔ اندر نے اس کے بازو کو آہستہ سے تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ کنور بھائی۔۔۔۔ اس لڑکی کا خط ہے" یہ کہتے ہوئے اندر کی آواز سنائی دینے کی بجائے اس کے گلے میں ہی پھنس کر رہ گئی۔ اس نے چاہا کہ اپنے بازو ایک جھٹکے سے

چھڑا کر پوچھے کون سی لڑکی---- کون لڑکی---- لیکن اس نے نہ بازو کو حرکت دی نہ لبوں کو۔

"لکھتی ہے---- اس کا باپ اس کو جان سے مار ڈالے گا۔ اور مجھے بھی۔

"کیوں؟" اس کے منہ سے بمشکل نکلا۔

اندر کی آواز بھی اٹکنے لگی---- وہ بیمار ہے۔ نہیں بیمار نہیں---- ڈاکٹر کہتا ہے---- اسے بچہ----

یہ سن کر اس کے ماتھے پر ایک بل پڑا۔ اس نے چبھتی ہوئی آواز میں پوچھا تیرا بچہ----؟ اندر نے شرم سے سر جھکا دیا۔ اس نے اسی طرح چبھتی آواز میں کہا۔ "اور---- وہ کیا کہتی ہے؟"

"شادی" اندر کے منہ سے صرف یہ ہی لفظ نکلا۔

ایک لمحے کے لئے تو وہ کچے اناروں پر بیٹھی ہوئی چڑیا کو دیکھتا رہا اور پھر ہنس دیا---- جا---- شیر جا---- جیسے وہ کہتی ہے۔ اسی طرح سے شادی رچا لے۔

اندر کا چہرہ انار کے پھولوں کی طرح کھل اٹھا۔ اس نے منہ سے کچھ نہ کہا لیکن اپنی کوٹھری کی طرف ایسے چل پڑا جیسے ابھی ابھی شادی کا بندوبست کرنا ہو۔ اور وہ بھی اپنی کٹیا کی طرف آگیا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اس نے چھت میں رکھی ہوئی ایک پوٹلی کھولی۔ اور اس نے آہستہ سے روپے اندر کو تھماتے ہوئے کہا۔ تجھے ضرورت ہوگی۔ سٹیشن کی راہ پر دو فرلانگ تک وہ اندر کے ساتھ ساتھ چلتا رہا اور پھر اچانک رک کر نیچے اپنی راہ کی طرف دیکھ کر بولا۔ تو پڑھا لکھا ہے۔ شہر میں کوئی نوکری کیوں نہیں ڈھونڈ لیتا؟

اور یہ کہہ کر وہ اپنے قدموں سے واپس لوٹ گیا۔۔ جیسے اس کا جنگل سنسان ہوگیا ہو۔ اور اس کا انتظار کر رہا ہو وہ اس کی تنہائی ایک دوسرے سے بغل گیر ہو کر ملے ہوں جنگل کی ساری فضا پھر اس کی اپنی ہوگئی۔ درختوں کے تمام پتے صرف اس کی آنکھوں کے لئے جھومتے تھے۔ ندی کا پانی صرف اس کے لئے بہتا تھا۔ دن صرف اس کے لئے طلوع ہوتا تھا اور رات صرف اس کے لئے آتی تھی۔

آٹھ دن گزر گئے۔ شام ڈھلنے کا وقت تھا۔ وہ چولہے کے قریب بیٹھا' کتاب پڑھ رہا تھا۔ دروازے کی جگہ رکھے ہوئے تختے پر دستک ہوئی۔ اس نے گھبرا کر تختے کو ایک طرف کیا۔ سامنے اندر کھڑا مسکرا رہا تھا۔ وہ حیران اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کے پیچھے کھڑی ایک لڑکی نے کوٹھری کی دہلیز پر آکر اس کے پاؤں کو چھوا اور سر جھکا کر اس کے قدموں میں کھڑی ہو گئی۔ جیسے اس سے آشیرباد لینا چاہتی ہو۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد اس نے لڑکی کے سر پر پیار اور شفقت سے ہاتھ پھیرا اور کہا "آؤ---- آؤ---- اندر آجاؤ۔

صبح کی ابلی ہوئی دال موجود تھی۔ آگ جلا کر جب اس نے چولہے پر توا رکھا تو لڑکی نے آگے بڑھ کر چکلا اور بیلنا اٹھا لیا۔ اور چولہے کے قریب بیٹھ کر روٹی بیلنے لگی۔ لڑکی کے ہاتھ میں کانچ کی چوڑیاں تھیں جب وہ روٹی بیلتی تو چوڑیاں چھنک چھنک جاتیں۔ اندر روٹی کھا رہا تھا' اور وہ بھی' لیکن اس کا دھیان صرف چوڑیوں کی چھنکار پر لگا ہوا تھا۔ جو دور تک پھیلی ہوئی درختوں کی' سائیں سائیں کرتی ہوا میں الگ تھلگ تھی اور اجنبی بھی۔ اور کانوں میں کھٹکتی تھی۔

دوسرے دن جھونپڑے کے ساتھ ایک نئی کوٹھری بن رہی تھی۔ اور نیچے گاؤں سے دو نئی چارپائیاں آرہی تھیں۔ نئے اوڑھنے بچھونے اور برتن بھی۔

گاؤں سے ٹوٹا ہوا زمین کا یہ خطہ جیسے گاؤں کا ہی ایک حصہ بن رہا تھا۔ گاؤں سے بڑھئی' معمار' مزدور آجا رہے تھے۔ ایک پانی بھرنے والا ندی سے پینے کا' پانی لانے کے لئے مقرر ہو چکا تھا۔ کھائی کے پار دکھائی دیتی پہاڑی تک جہاں تک نظر کے پرندے کی اڑان تھی۔ وہ بہت بڑی کوٹھری کی تعمیر کو دیکھ کر یوں تڑپ اٹھا جیسے اس کے وجود سے اس کے پر اتارے جا رہے ہوں۔

اندر نے بڑے ملائم لہجے میں کہا "آپ کہتے تھے تاکہ میں پڑھا لکھا آدمی ہوں اور کوئی کام کروں۔ میں نے سوچا یہاں بچوں کے لئے ایک اسکول کھول دیں۔ نیچے کسی گاؤں میں کوئی اسکول نہیں۔ بس پچاس پیسے یا ایک روپیہ فیس رکھ لوں گا۔ اتنے پیسے تو کوئی بھی----

یہ سنتے ہی اس کے دونوں کانوں میں جیسے زخم ہو گئے ہوں۔

اگلے ماہ اندر کہہ رہا تھا۔ سنا ہے پرسوں اسٹیشن کے ساتھ والے گاؤں میں ایک وزیر آ رہا ہے۔ آپ بزرگ ہیں۔ آپ انہیں جاکر کہیں کہ ہماری زمین تک سڑک کو پختہ کرا دیں اور ساتھ ہی بجلی بھی لگوا دیں۔ اسٹیشن تک تو بجلی آتی ہے۔ اس کے کانوں میں درد کی ٹیسیں اٹھنے لگیں۔ جیسے زخموں سے پیپ رس رہی ہو۔

اندر گزشتہ دو ماہ سے شہر گیا ہوا تھا۔ جب وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے ٹرانسسٹر کی آواز دور ایک پہاڑی سے دوسری پہاڑی تک جا رہی تھی۔ اور نیچے گاؤں کے بہت سے بچوں کا ایک ہجوم اوپر چلا آرہا تھا۔ اندر قریب پہنچا اور مسکرا کر کہنے لگا۔ دیکھو کنور بھائی یہاں کوئی اخبار تو آتا نہیں اب ہم روز کی خبریں بھی سن سکیں گے اور----

اگلے ماہ نیچے والے گاؤں سے آنے والی دائی نے کہا۔ خدا سلامت رکھے۔ اب تو گنتی کے چند دن رہ گئے ہیں۔ بچے کے لئے ایک گائے کا بندوبست کرو۔ سکھ سے گھر میں رونقیں آنے والی ہیں۔

اسے پہاڑی کی اوٹ میں نکلتے سورج کی طرف جو کچھ دیر پہلے دھندلا دھندلا سا دکھائی دیتا تھا۔ اب کچھ صاف دکھائی دینے لگا تھا۔ جیسے وہ پھر سے سات برس کے بعد اپنا پرانا خواب دیکھ رہا ہو۔

بیس برس کا ایک پرانا خواب---!!

اور ندی بہتی رہی

ایک حادثہ تھا---- جو ندی کے پانی میں بہتا ہوا کسی ایسے عہد کے کنارے آ کھڑا ہوا تھا- جہاں ایک گھنے جنگل میں دید دیاس تپ کر رہے تھے-

سادھو کا تسلسل ٹوٹا تو سامنے رانی ستہ وتی اداس لیکن دیوی سندری کے روپ میں کھڑی تھی-

پیڑ کے پتوں کی طرح جھک کر دید دیاس نے پرنام کیا' اور کہا---- تم میری سدیویں ماں ہو- آج اداسی کا یہ بھیس کیوں؟

ماں نے رکھی بیٹے کو پیار سے بھری چھاتی سے لگا کر کہا---- تو رکھی دنش سے ہو- تم محبت کے درد کو نہیں جانتے---- راج کا درد میں نے راجہ سانت نو سے پایا- اور اس کے راج کی حفاظت کے لئے میں نے جس کوکھ سے تجھے جنم دیا تھا- اسی کوکھ سے راجہ سانت نو کے دو بیٹوں کو جنم دیا تھا- ایک راجکمار بدھ میں مارا گیا- اور دوسرا دو رانیوں کو روتا چھوڑ کر کسی روگ سے مر گیا-

پیڑ کے سارے پتے جیسے کملا کر دید دیاس کے تپسی چہرے کو دیکھنے لگے----

رانی ستیاوتی کا دل گنگا کی نرمل لہروں کی طرح بہنے لگا- کہنے لگی---- مہارکھی پر مشیر نے گنگا کے پانی کی طرح مجھے چھوا تھا- تم اس کے موتی ہو' پانی صحرا' جنگل' بیابان تمہارے تابع ہیں- تم تاج میں جڑے ہوئے موتی کا درد نہیں جانتے-

پیڑ کے سبزے کی طرح دیدویاس کے ہونٹ مسکرا دیئے میں راج کا درد نہیں جانتا' لیکن ماں کا درد جانتا ہوں----؟

سیتاوتی پیڑ کے گلے میں لپٹی بیل کی طرح جھوم کر کہنے لگی، تاج کے موتی کو تخت چاہئے۔ اور تخت کو وارث۔ میری دونوں بہوئیں آج بدھوا ہیں۔ آج میں ان کے لئے تجھ سے بیٹے کا دان مانگنے آئی ہوں۔۔۔۔!

دید دیاس نے سر پر پھیلے پیڑ کی طرف دیکھا۔ "سارا پیڑ کھل اور سمٹ کر دھرتی کے سینے میں پڑے ہوئے اپنے بیج کی طرف دیکھنے لگا۔۔۔"

رکھی کے ہونٹ ہنس پڑے، کہا۔۔۔ "ماں اور دھرتی کا حکم پورا ہوگا۔۔۔" اور دید یاس نے اپنا وچن پورا کیا۔۔۔ انبکا اور آنبالکا دونوں کو ایک ایک بیٹا دان کیا۔۔۔۔

۲

ندی کا پانی بچوں کی کلکاری کی طرح ہنستا ہوا پھر سے بہنے لگا تو وہی حادثہ کسی قدیم عہد سے گزرتا ہوا جدید عہد کے کنارے پر آکھڑا ہوا۔ یہاں بلدیو کا عام سا گھر تھا۔ یہاں میز پر پڑی کتابوں میں صرف مہا بھارت کے باب ہی نہیں تھے کامیو، کافکا اور پاسترناک بھی۔۔۔۔

اس کا دوست کاشی ناتھ پیڑ کے ایک ٹوٹے ہوئے پتے کی طرح اس کے سامنے آکھڑا ہوا۔ اور کہنے لگا۔ "جو دان مجھے نہ خدا دے سکا نہ کسی دید کا دارو۔ وہ دان میں تجھ سے مانگنے آیا ہوں۔۔۔۔ ایک بیٹے کا دان۔"

سر پر کوئی پیڑ نہ تھا۔ پھر بھی بلدیو کے کانوں میں پتوں کی سائیں سائیں بھر گئی۔ کاشی ناتھ کہہ رہا تھا۔ "میری عورت کے ان چھوے بدن کو ایک مرد کے بیمار بدن کی بدعا لگی ہوئی ہے۔ میرے دوست، بس اس بدعا کو ایک لمحے کے لئے اس سے جدا کر دو۔

بلدیو کا سارا بدن پیڑ کی جڑ کی طرح ہوگیا۔ کاشی ناتھ آوارہ پتے کی طرح اڑتا ہوا اس کے پاؤں میں آگرا" یہ بھید صرف میں تو اور وہ جانتے ہیں۔ دوسرا کوئی نہیں۔۔۔۔ کوئی نہیں۔۔۔، بلدیو کے پیڑ کی جڑ کی طرح پھوٹے ہوئے بدن میں

سے ایک خیال اُگ آیا---- یہ صرف اتہاس کا حکم ہے۔ میں شاید ایک دیدیاس ہوں---- ایک رکھی----

کاشی ناتھ کے گھر بیٹا پیدا ہوا۔ سب کے منہ بدھائی سے بھر گئے۔ اور جب بلدیو نے ہنڈولے میں پڑے ہوئے بچے کو اڑ کر دیکھا۔ تو اس کے لب دیدیاس کے لب کی طرح بند ہو گئے۔

3

"نہیں۔ نہیں میں دیدیاس نہیں----" بلدیو کی اپنی ہی چیخ اس آواز کے ساتھ آنکھ کھل گئی---- چاپائی کے نزدیک تپائی پر ابھی تک رات کی بچی ہوئی وسکی پڑی ہوئی تھی۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے گلاس میں وسکی انڈیلی اور گھونٹ گھونٹ پیتے ہوئے بہادروں کی طرح بولنے لگا۔ "تم دیو پتر تھے تھے۔ دیدیاس تم مانیو پتر نہیں تھے۔"

بلدیو کے خیال اسے صدیوں دور ایک جنگل میں لے گئے۔ اور وہ جنگل کے ورلدپ کی طرح بولا---- رکھی راج' تمہارے پاس سمادھی ہے صرف سمادھی---- لیکن میرے پاس خواب ہیں---- ڈھیروں خواب----؟

بلدیو کے الفاظ سینے میں سے اٹھ اٹھ کر درختوں سے ٹکراتے رہے۔ دیکھ رکھی بیٹے میری طرف دیکھ - یہ دیکھ میری---- آنتھیکا----؟

تجھے تو اپنی آبنکا کی دوسرے دن ہی پہچان نہ رہی۔ لیکن دیکھو' یہ میری پرچھائیں نہیں۔ میری آنبکا ہے---- میں جہاں جاؤں میرے ساتھ جاتی ہے۔

بلدیو زور سے ہنسا---- دیکھ لے رکھی بیٹے تیری کوئی پرچھائیں نہیں---- لوگ سچ کہتے ہیں نہ تو دیوتوں کی پرچھائیں نہیں ہوتیں۔ لیکن انسان کو تو پرچھائیں کی بدعا ہے---- دیکھ میری پرچھائیں مجھ سے بھی بڑی----

بلدیو کی آواز پھیلی ہوئی چپ کے ساتھ ٹکرا کے بے بس ہو گئی---- تیری قیر کھل گئی تھی---- جب ستیاوتی نے آواز دی تھی۔ لیکن میری آواز کے ساتھ

نہیں کھلتی" کیوں نہیں کھلتی---- تم آبنکا کی جھولی میں کھیلتا اپنا بیٹا کبھی اپنی بانہوں میں لے کر نہیں دیکھا۔ میں نے دیکھا ہے اسے بانہوں میں لے کر گلے سے لگا کر---- اور تم نہیں جانتے، پھر اسے گلے سے الگ کرنا اپنے بدن کے گوشت کے ٹکڑے کو الگ کرنے ایسا ہے۔

بلدیو کا سارا جسم بدن سے بہتے لہو میں بھیگ گیا۔ "تو نے کبھی لہو کی مہک نہیں دیکھی" رکھی بیٹے۔ آدمی کے لہو کی ایک بو بھی ہوتی ہے۔ جب وہ دل کی تہہ تک زخمی ہو جاتا ہے۔

لہو کی ایک مہک بھی ہوتی ہے جب بچے کے ملائم ملائم ہونٹ ہنستے ہیں، اس وقت اپنے ہی بدن میں لہو کی ایک مہک اٹھتی ہے۔

اور ایک تیکھی مہک بلدیو کے ماتھے کی رگوں میں پھیل گئی اور وہ نیم بے ہوشی کے عالم میں بولا۔ میری آبنکا کے بدن کی مہک چاہے کہیں چلی جائے، میں اسے ڈھونڈ سکتا ہوں۔ اس کی کانپتی سانسیں یہاں میرے کندھوں کے پاس، باہوں کے پاس، میرے گلے کے قریب ایک امانت کی طرح پڑی ہیں---- اور دیکھ میرے اندر بھی---- میں نے اس کے ہونٹوں سے ایک پورا گھونٹ پیا تھا۔

بلدیو کے ماتھے کی ایک رگ ٹیس کی طرح کھچ گئی۔ اور وہ نچلے ہونٹ کو دانتوں میں دبا کر کہنے لگا۔ "رکھی بیٹے" تو صرف دینا چاہتا تھا۔ تجھے کچھ لینے کی اور کچھ دینے کی قربان کرنے کی پہچان نہیں تھی۔ میں نے وہ پہچان حاصل کر لی ہے۔ میں جب آبنکا کے بدن کی تہوں میں اترا تھا۔ اور تہیں مجھے اپنی مٹھی میں لے کر بند ہو گئیں۔ اور پھر جب پھول کی پتیوں کی طرح کھلی تھیں۔ میں واپس لوٹا تو اس کا ایک حصہ اپنے ساتھ لے آیا تھا---- وہ صرف کچھ دینے کا نہیں۔ لینے کا بھی لمحہ تھا۔ میں نے وہ لمحہ بھی دیکھا ہے رکھی بیٹے۔ تو نے نہیں دیکھا۔ دینا درد نہیں ہوتا لینا ایک درد ہوتا ہے۔ تو اس درد کو نہیں جانتا میرے رکھی راج----

"اردگرد ایک سکون تھا۔ اور درد بھی تھا۔ جہاں تک بلدیو کو زندگی کے رہتے برسوں کا مستقبل دکھائی دے سکتا تھا۔ وہاں تک----"

ایک بے پناہ خاموشی' ایک چپ اندھیرا' لیکن بلدیو اندھیرے میں پڑے ہوئے اندھیرے کے ایک کمرے کی طرح گہرا ہو کے اپنی آنکھوں میں سمٹ گیا۔ اس کے ہونٹ کچھ اس طرح ہلتے رہتے تھے جیسے اندھیرے کی تہیں حرکت کر رہی ہوں۔ وہ میرے پاس آگ کی ایک چنگاری لینے کے لئے آئی تھی۔ مجھے اس چنگاری کی خاطر جلنا تھا۔ جلا تھا۔ لیکن یہ نہیں جانتا تھا۔ شاید وہ بھی نہیں جانتی تھی کہ چنگاری کو اپنانے کے لئے اسے بھی آگ کے سراب میں سے گزرنا پڑتا ہے۔ آگ اسے بھی چھو گئی تھی۔ اور وہ کانپ گئی تھی۔ وہ تمام کی تمام مجھ میں سمٹ گئی تھی۔ جیسے وہ اپنی لو سے شرما گئی ہو۔اور اب میری اس راکھ میں وہ بھی جل کر بجھ کر اپنی راکھ ملا گئی--- دیکھ رکھی راج---- سرت کے اندھیرے میں ایک اکارہ ایسا ابھرا' کوئی پتھر کی مورتی ایسا شاید سمے کے ساتھ سچ مچ پتھر ہو چکا تھا یا ابھی تک زندہ یا تپسیا میں مگن بیٹھا ہوا۔

بلدیو نے اندھیرے میں باہیں پھیلا دیں۔ نیچے زمین کو ٹٹول کر اس کے پاؤں کو چھونے کے لئے اور کانپتی باہوں کی طرح اس کی آواز کانپی---- میں بھول گیا رکھی راج----"

میں نے آدم پتر ہو کر تمہاری نقل کی تھی۔ میں نے ایک لمحہ سے گزر کر دیکھا صرف ایک پل---- میں نے جیسے ایک پل کے لئے تیرا آسن چرا لیا تھا۔ لیکن "میں "تو" نہیں ہو سکتا۔ تم اپنے جنگل میں آج بھی آرام سے بیٹھے ہو میں اپنے جنگل میں بھٹک رہا ہوں۔ مجھے صرف دیو کا بر نہیں ملا۔ لین کا سراپ بھی ملا ہے۔ میں اپنی آنیکا اپنے پاس چاہتا ہوں-- اپنا بچہ بھی--- دیکھ میری آنکھیں صرف میرے چہرے پر نہیں میری پیٹھ پر بھی ہیں۔ اور پیچھے دور وہاں تک دیکھ رہی ہیں۔ جہاں میری آنیکا میرے قریب تھی' میری کمر سے لگی ہوئی' اور میں اس کی کوکھ میں اگ رہا تھا۔

بلدیو کی نیم ہوش مندی پھر نیند کی اونگھ بن گئی اور کمرے کی خاموشی نے ایک سکھ کا سانس لیا۔ صرف کھڑکی سے آتی ہوا کے جھونکوں سے میز پر پڑی کتابوں

کے کچھ صفحے اسی طرح سرک رہے تھے جیسے مہابھارت کا کوئی صفحہ اٹھ کر کامیو کے ''آؤٹ سائیڈر'' کو کہہ رہا ہو---- یا پاستر ناک کا ''ژواگو'' آنکھیں ملتا ہوا' مہارکھی پر اثر سے متسکیندھا کے یوجن کندھابن کا بھید پوچھ رہا ہو۔

اچانک کمرے کی خاموشی تھرک کر بلدیو کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ تڑپ کر بستر سے اٹھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ یہ کیا سراپ ہے۔ دیددیاس ---- جب بھی سوچتا ہوں۔ آگ کی طرح جلنے لگتا ہوں۔ میں بھی---- میر آ ابکا بھی---- اور جب بھی جاگتا ہوں راکھ کا ایک ڈھیر بن جاتا ہوں۔ بتاؤ میرا بچہ بڑا ہو کر اس راکھ میں اپنی ونش کیسے ڈھونڈے گا۔

اور ندی اسی طرح بہتی رہی---- صرف اس کے پانیوں نے کچھ شرم سار ہو کر دیکھا کہ وہ حادثہ راکھ بن کر دور کنارے بکھرا پڑا ہے۔

❀❀❀

یہ کہانی نہیں

پتھر اور چونا تو بہت تھا لیکن تھوڑی سی جگہ پر اگر دیواروں کی طرح کھڑا ہو جاتا۔ تو گھر کی چار دیواری میں ڈھل جاتا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ زمین پر سڑکوں کی طرح پھیل گیا اور اس طرح وہ دونوں تمام عمران سڑکوں پر چلتے رہے۔

سڑکیں ایک دوسری کے پہلو سے پھوٹتی ہی نہیں بلکہ ایک دوسری کے بدن کو چیر کر گزرتی بھی ہیں۔ ایک دوسری سے ہاتھ چھڑا کر گم ہو جاتی ہیں یا ایک دوسری میں جذب ہو جاتی ہیں۔ وہ ایک دوسرے سے ملتے رہے لیکن صرف اس وقت جب کبھی کبھار ان کے پاؤں کے نیچے بچھی ہوئی سڑکیں ایک دوسرے کو آملیں۔ گھڑی پل کے لئے شاید سڑکیں بھی بدک کر کھڑی ہو جائیں اور ان کے پاؤں بھی۔۔۔۔ اور شاید دونوں کو اس گھر کی یاد آجاتی ہو جو بنا نہ تھا۔

بن سکتا تھا۔۔۔۔ "لیکن کیوں نہ بنا۔؟" وہ دونوں حیرانی سے پاؤں کے نیچے آئی زمین کو یوں دیکھنے لگے جیسے وہ یہ بات زمین سے پوچھ رہے ہوں۔

وہ دیر تک زمین کی طرف یوں دیکھتے رہتے جیسے اپنی آنکھوں سے انہوں نے زمین میں اس گھر کی بنیادیں کھود لینی ہوں۔

کئی بار تو سچ مچ وہاں ایک طلسماتی گھر تعمیر ہو جاتا اور وہ دونوں مطمئن سے ہو جاتے، جیسے برسوں سے اس گھر میں رہ رہے ہوں۔ یہ ان کی جلتی جوانی کے دنوں کی بات نہیں، اب کی بات ہے، ٹھنڈی عمر کی بات،

"آ" سرکاری میٹنگ کے لئے "س" کے شہر آئی ہوئی تھی۔ "آ" کو وقت نے "س" کے برابر سرکاری عہدہ اور برابر کی حیثیت بھی۔ میٹنگ سے فارغ ہو کر

جب ''آ'' اپنے شہر لوٹنے لگی تو ''س'' نے آگے بڑھ کر ''آ'' کا ٹکٹ پکڑ لیا' اسے گاڑی میں بیٹھنے کے لئے کہا اور پوچھا۔ سامان کدھر ہے؟ ''ہوٹل میں۔۔۔۔''

''س'' نے ڈرائیور کو پہلے ہوٹل اور پھر واپس گھر چلنے کے لئے کہا ''آ'' سے انکار نہیں ہو سکا لیکن سوچ کر کہا۔ ''جہاز کو اڑنے میں صرف دو گھنٹے باقی ہیں بمشکل ہوٹل سے ہو کر ایئرپورٹ تک پہنچ سکوں گی۔

''جہاز کل بھی جا سکتا ہے اور پرسوں بھی' اور روز جائے گا۔'' ''س'' نے صرف اتنا کہا اور تمام راستے خاموش رہا۔ ہوٹل سے سوٹ کیس لے کر گاڑی میں رکھا تو ایک بار پھر ''آ'' نے کہا ''وقت کم ہے اس طرح پرواز مس ہو جائے گی۔

''س'' نے جواب دینے کی بجائے صرف اتنا کہا۔ گھر پر ماں انتظار کر رہی ہو گی۔ ''آ'' نے سوچا شاید ''س'' نے ماں کو اس میٹنگ کے متعلق سب کچھ بتا دیا ہو گا لیکن وہ کچھ سمجھ نہ پائی یہ سب کچھ کیوں کر بتایا گیا تھا۔

''آ'' کبھی کبھی دل سے یہ کیونکر والا سوال پوچھ تو لیتی تھی لیکن اس کے جواب کا انتظار نہیں کرتی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ اس کے دل کے پاس بھی اس کا کوئی جواب نہیں تھا اس لئے وہ خاموش بیٹھی گاڑی کے شیشوں سے باہر عمارتوں کو دیکھتی رہی۔ چند لمحوں کے بعد عمارتوں کا یہ سلسلہ ٹوٹ گیا۔ پھر شہر سے دور ایک وادی جہاں پام کے بڑے بڑے پیڑوں کا سلسلہ شروع ہوتا تھا پہنچے۔ شاید سمندر کے قریب ہونے سے اسے اپنی سانسیں نمکین ہوتی محسوس ہوئیں۔ پام کے پتوں کی طرح اس کے ہاتھوں میں لرزش آگئی شاید ''س'' کا گھر قریب آگیا تھا۔

پیڑوں اور پتوں میں لپٹی ایک کاٹیج کے قریب پہنچ کر گاڑی رک گئی ''آ'' گاڑی سے اتر کر کاٹیج میں جانے کی بجائے چند لمحوں کے لئے باہر کیلے کے پیڑوں کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔۔۔۔ اس نے چاہا کہ اپنے کانپتے ہاتھوں کو یہاں باہر کیلے کے لرزتے پتوں میں رکھ دے تبھی وہ ''س'' کے ساتھ اندر کاٹیج میں جا سکتی تھی۔ کیونکہ وہاں ہاتھوں کی کوئی خاص ضرورت بھی تو نہ تھی۔ ان ہاتھوں سے اب وہ نہ ''س'' کو کچھ دے سکتی تھی اور نہ ''س'' سے کچھ لے سکتی تھی......

ماں نے شاید گاڑی کی آواز سن لی تھی اس لئے وہ باہر چلی آئی اور ہمیشہ کی طرح ''آ'' کی پیشانی کو چوما اور کہا۔ آؤ بیٹی----

اس بار ''آ'' برسوں کے بعد ماں سے ملی تھی ماں نے اس کے سر کو ہاتھ کی ہتھیلی سے یوں سہلایا جیسے سر سے برسوں کا بوجھ اتار دیا ہو۔ وہ اسے اندر لے جا کر بٹھاتے ہوئے پوچھنے لگی۔ ''بیٹی کیا پیو گی۔''

''س'' بھی اندر آکر ماں سے کہنے لگا پہلے چائے بناؤ پھر کھانا---- ''آ'' نے دیکھا کہ ڈرائیور گاڑی میں سے اس کا سوٹ کیس اندر لے کر آرہا ہے۔ اس نے ''س'' کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ''وقت بہت کم ہے ہم ایئرپورٹ تک نہیں پہنچ پائیں گے۔''

نہیں.....! اس نے کہا اور ڈرائیور کو حکم دیا۔ کل صبح جا کر پرسوں کے لئے سیٹ کنفرم کرا لینا۔ اس کے بعد ماں سے مخاطب ہوا۔ ماں جی آپ تو کہتی تھیں کہ میرے چند دوستوں کو کھانے پر بُلانا ہے تو پھر آج بلوالو ----

''آ'' نے ''س'' کی جیب کی طرف دیکھا جس میں اس کا سرکاری ریٹرن ٹکٹ تھا۔ اس نے بڑی شائستگی سے کہا ''یہ ٹکٹ ضائع ہو جائے گا۔''

ماں رسوئی کی طرف جانے کیلئے اٹھی اور کندھے پر اپنی ہتھیلی رکھتے ہوئے کہنے لگی ''ٹکٹ کا کیا ہے بیٹی جب اتنا اصرار کر رہا ہے تو پھر رک جاؤ۔''

''لیکن کیوں'' ''آ'' کے دل میں تو آیا لیکن ہونٹوں پر نہیں۔ وہ کرسی سے اٹھ کر کمرے کے ساتھ برآمدے میں آکھڑی ہوئی۔ سامنے دور تک پام کے اونچے اونچے پیڑ تھے۔ اور اس سے دور سمندر کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ ''آ'' کو محسوس ہوا صرف آج ہی کیوں نہیں۔ اس کی زندگی کے اور کتنے کیوں'' اس کے دل کے سمندر کے کنارے پام کے پیڑوں کی طرح اگے ہوئے ہیں۔ اور ان کے پتے کئی برسوں سے ہوا میں لرز رہے ہیں۔

''آ'' نے مہمانوں کی طرح چائے پی' رات کا کھانا اور غسل خانے کا پوچھ کر رات کے سونے کے کپڑے تبدیل کئے۔ گھر میں ایک چوڑا ڈرائنگ روم اور دو

سونے کے کمرے تھے ایک "س" کا اور دوسرا اس کی ماں کا جس کو ضد کرکے ماں نے "آ" کو دے دیا اور خود ڈرائنگ روم میں سو گئی۔

"آ" سونے والے کمرے میں تو چلی گئی لیکن وہ دیر تک کھڑی سوچتی رہی کہ یہاں ایک دو راتیں مسافروں کی طرح رہ جاتی ہوں۔ یہ بھی درست ہے کہ یہ کمرہ ماں کا ہے۔

لیکن پھر بھی سونے کے کمرے میں پلنگ کی چادروں پر' الماریوں میں ایک گھریلو مہک اٹھی اس نے اس مہک کا ایک گھونٹ سا بھرا لیکن پھر اپنے اندر کے کسی ڈر سے سانس روک لی۔ "س" کا ساتھ والا کمرہ تھا۔

خاموشی' چپ' سناٹا' چند لمحے پہلے "س" نے سر درد کی شکایت کرکے خواب آور گولی لی تھی' اور شاید اب سو گیا ہو۔ ملحقہ کمرے کی بھی ایک مہک ہوتی ہے "آ" نے ایک بار اس کا بھی گھونٹ پینا چاہا لیکن سانس رکی رہی۔ یکدم "آ" کا دھیان الماری کے نزدیک فرش پر پڑے سوٹ کیس کی طرف گیا۔ اس نے خود پر ہنستے ہوئے کہا' یہ سوٹ کیس مجھے تمام رات ایک مسافر کی یاد دلاتا رہے گا "وہ سوٹ کیس پر تھکی نگاہیں ٹکائے' تھکاوٹ سے چور سرہانے پر سر رکھ کر لیٹ گئی معلوم نہیں کب نیند آئی جب نیند سے جاگی تو دن بہت چڑھ آیا تھا۔ اسے رات کو ہونے والی دعوت کا خیال آیا۔ پھر ایک دم اس نے آنکھیں جھپک کر دیکھا سامنے "س" کھڑا تھا۔ نیلے رنگ کے خانوں والا تہبند پہنے ہوئے۔ "آ" نے کبھی "س" کو رات کے پہننے والے کپڑوں میں نہیں دیکھا تھا۔ اس نے تو ہمیشہ اسے کسی نہ کسی سڑک پر یا سڑک کے کنارے کیفے ہوٹل یا سرکاری میٹنگوں میں دیکھا تھا۔ اس کی یہ پہچان ایک نئی تھی جو "آ" کی پلکوں پر اٹک کر رہ گئی۔ حالانکہ خود اس نے نائٹ سوٹ پہن رکھا تھا۔ جب اس کی توجہ اس طرف لوٹی تو اسے اپنا آپ عجیب سا لگا۔ جسے عام بھی کہا جا سکتا ہے اور خاص بھی۔ جب اس نے "س" کو بالکل قریب آتے دیکھا تو اس نے کہا۔ یہ صوفے لمبی طرف لگا دیں تو درمیان میں سے جگہ کھل جائے گی۔ اور پھر "آ" نے "س" کی مدد سے صوفوں اور چھوٹی میزوں کو اٹھا کر

کرسیوں کے درمیان رکھ دیا۔ ماں نے رسوئی سے آواز دی تو "آ" نے چائے لاکر میز پر رکھ دی"

چائے پی کر "س" نے کہا "آؤ چلیں جن لوگوں کو مدعو کرنا ہے۔ انہیں اطلاع کردیں "اور واپسی پر کچھ پھول بھی لے آئیں گے۔"

دونوں نے پرانے واقف کاروں کے گھروں پر دستک دے کر پیغام دیا اور واپسی پر راستے میں ضروری اشیا خریدیں' دوپہر کا کھانا گھر پر کھایا اور ڈرائنگ روم کو پھولوں سے سجانے لگے۔ راستے میں دونوں کے درمیان عام سی گفتگو ہوتی رہی۔ پھول کون سے لینے ہیں۔ پان لیں یا نہ لیں' پینے کے ساتھ کباب کتنے ہوں گے۔ فلاں کا گھر راستے میں ہے۔ اس لئے اسے بھی بلا لیا جائے۔ یہ سب باتیں ایسی نہیں تھیں۔ کہ جنہیں کوئی/برسوں کے بعد ملے اور کرے۔ "آ" کو دوستوں کے گھروں پر دستک دینے کے بعد تھوڑی سی پریشانی کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ اگرچہ یہ سب دوست "س" کے تھے اور عرصہ سے "آ" کو بھی جانتے تھے۔ لیکن دروازہ کھول کر جب "آ" کو "س" کے ساتھ دیکھتے تو حیرانی سے پوچھتے---- "آپ"؟

جب وہ گاڑی میں اکیلے بیٹھے تھے تو "س" نے ہنس کر کہا "دیکھا---- کتنا حیران ہوا تھا۔" اس سے تو بولا بھی نہیں جا رہا تھا۔ پھر ایک دو جملوں کے بعد دوستوں کی حیرانی بھی ان کی عام گفتگو میں شامل ہو گئی۔

"س" کی طرح "آ" بھی اوپر سے ہنس دی۔

شام کو "س" نے سینے میں درد کی شکایت کی تو ماں نے کٹوری میں برانڈی ڈال کر دی اور "آ" سے کہا' لے بیٹی۔ ذرا اس کے سینے پر مل دو۔"

اس وقت تک شاید اتنا کچھ تو خود بخود ہو چکا تھا "آ" نے "س" کی قمیض کے اوپر کے بٹن کھول کر ہاتھ کی ہتھیلی سے "س" کی چھاتی پر برانڈی ملنے لگی۔

باہر پام کے پیڑوں اور کیلوں کے پتے ابھی تک ہوا میں لرز رہے تھے۔ لیکن "آ" کے ہاتھ ساکت تھے۔ ایک دوست وقت سے پہلے آپہنچا تھا۔ "آ" نے برانڈی سے بھیگے ہاتھوں سے اسے خوش آمدید کہا اور دوبارہ کٹوری میں سے برانڈی سے ہاتھ

بھگو کر ''س'' کی گردن سے کندھوں تک ملنے لگی۔

کمرہ آہستہ آہستہ مہمانوں سے بھر گیا۔ ''آ'' فریج سے برف نکالتی رہی اور سادہ پانی بھر بھر کر رکھتی رہی۔ بیچ بیچ رسوئی کی طرف بھاگتی ٹھنڈے کباب دوبارہ گرم کر کے لاتی رہی۔ ایک بار ''س'' نے ''آ'' کو سرگوشی کی۔ کہ تین چار تو بن بلائے مہمان پہنچ گئے ہیں۔

''ضرور دوستوں میں سے کسی نے انہیں دعوت دی ہوگی۔''

''نہیں' تجھے دیکھنے کے لئے آگئے ہوں گے۔''

تب ''آ'' کی یکسوئی لمحہ بھر کے لئے ٹوٹی۔ لیکن ''س'' نے اسے چند گلاس دھونے کے لئے کہا۔ تو ''پھر سے مطمئن ہوگئی۔

جیسے جیسے رات بھیگ رہی تھی۔ محفل میں گرمی پیدا ہو رہی تھی۔ آدھی رات کے قریب جب سب چلے گئے۔ تو ''آ'' نے سونے کے کمرے میں جا کر نائٹ ڈریس پہنتے ہوئے محسوس کیا۔ سڑکوں پر خیالوں کا بنا طلسمی گھر اب کہیں نہیں---- یہ طلسمی گھر اس نے کئی بار دیکھا---- بنایا---- اور مٹایا تھا۔ اس لئے ایسی کوئی حیرانی بھی نہ تھی۔ سوائے صرف تھکن کے۔ وہ تکیے پر سر رکھے سوچ رہی تھی۔ کب کی بات ہے شاید پچیس برس ہونے کو ہیں' نہیں لگ بھگ تیس برس۔ جب وہ پہلی بار زندگی کی سڑک پر دونوں ملے تھے۔ ''آ'' کون سی سڑک پر سے اور ''س'' کون سی سڑک آیا تھا۔ دونوں کے لئے یہ پوچھنا اور بتانا مشکل تھا۔ وہ دونوں نگاہیں جھکائے زمین پر بنیاد کھودتے رہے۔ جس سے وہاں ایک طلسمی گھر کھڑا ہوگیا۔ جس میں وہ دونوں اطمینان سے سارا سارا دن بسر کرتے تھے۔ لیکن جب دونوں کی اپنی اپنی الگ سڑک نے انہیں آواز دی تو وہ اپنی اپنی راہ پر چلنے لگے خوفزدہ اور سہمے ہوئے لیکن جب انہوں نے دیکھا تو دونوں کے درمیان ایک گہری کھائی تھی۔

''س'' کتنی دیر اس کھائی کی طرف دیکھتا رہا جیسے پوچھ رہا ہو کہ وہ اس کھائی کو کس طرح پار کرے گی؟ ''آ'' نے کوئی جواب نہیں دیا صرف ''س'' کے ہاتھ کی

طرف دیکھا جیسے کہہ رہی ہو۔ اگر تم اس ہاتھ کو تھام لو' تو میں مذہب کی اس کھائی سے گزر جاؤں گی۔

جب "س" کی نگاہ "آ" کے ہاتھ کی طرف اٹھی تو دیکھا اس نے ہیرے کی انگوٹھی پہن رکھی ہے۔ وہ کتنی دیر اسے یوں دیکھتا رہا۔ جیسے پوچھ رہا ہو۔ تمہاری انگلی میں یہ جو قانون کا دھاگہ لپٹا ہوا ہے۔ میں اس کا کیا کروں گا۔

"آ" نے انگوٹھی کی طرف دیکھا اور دھیرے سے مسکا دی۔ اس کی مسکان کہہ رہی تھی۔ تم ایک بار کہو تو سہی میں یہ قانون کا دھاگہ اپنے ناخنوں سے کھول دوں گی۔ ناخنوں سے نہ کھلا تو دانتوں سے کھول دوں گی۔

"س" اور "آ" دونوں خاموش کھڑے رہے' بالکل ایسے جیسے سڑکیں---

وہ دونوں ساتھ چلتے رہے جیسے سڑکیں۔

ایک دن "س" کے شہر سے آئی سڑک "آ" کے شہر تک پہنچ گئی۔ اس نے "س" کی آواز سنی۔ وہ اس وقت اپنے ایک برس کے بچے کو گود میں لئے باہر سڑک پر اس کے قریب آکھڑی ہوئی۔ "س" نے آہستہ سے ہاتھ بڑھا کر سوئے بچے کو "آ" سے لے کر اپنے کندھے سے لگا لیا۔ پھر وہ تمام دن شہر کی سڑکوں پر چلتے رہے۔

وہ دن ان کی جلتی جوانی کے دن تھے۔ انہیں نہ دھوپ لگتی تھی نہ سردی جب وہ چائے پینے کے لئے ایک کیفے میں گئے تو بہرے نے ان کے لئے ایک کونے کی میز کو صاف کر دیا۔ اس طرح کیفے کے ایک کونے میں ایک طلسمی گھر تعمیر ہو گیا۔

ایک بار دونوں کی اچانک چلتی گاڑی میں ملاقات ہو گئی۔ "س" اپنی ماں اور دوست کے ساتھ سفر کر رہا تھا۔ "آ" کی سیٹ ان سے بہت دور تھی۔ لیکن "س" کے دوست نے اپنی سیٹ "آ" کے لئے خالی کر دی۔ گاڑی کا یہ سفر دن میں ٹھنڈا نہیں تھا لیکن رات کافی بھیگ گئی تھی۔ ماں نے دونوں پر اپنا کمبل پھیلا دیا۔ اس طرح چلتی گاڑی میں کمبل کی اوٹ نے ایک طلسمی گھر کی دیواریں کھڑی ہو گئیں۔

یوں طلسمی دیواریں بنتی اور مٹتی رہیں آخر کار ان کے درمیان کھنڈروں ایسی

خاموشی کا ایک ڈھیر بن گیا۔

"س" ہر بندھن سے آزاد تھا اور "آ" ہر بندھن کو توڑ سکتی تھی۔ لیکن وہ دونوں تمام عمر سڑکوں پر چلتے رہے۔ اب تو عمر بیت چکی تھی۔ "آ" نے عمر کی ان بدلتی رتوں کے متعلق سوچا اور اب کے ٹھنڈے موسموں کے دنوں کے بارے محسوس کیا کہ تمام دن وہ پام کے پتوں کی طرح ہوا میں کھڑے کانپتے رہے۔

بہت دن ہوئے ایک بار "آ" نے برسوں کی خاموشی کو توڑتے ہوئے "س" سے کہا۔ تم بولتے کیوں نہیں؟ "س" نے جواب دیا۔ یہاں روشنی زیادہ ہے اور ہر جگہ روشنی ہوتی ہے لیکن مجھ سے روشنی میں بولا نہیں جاتا۔"

اس وقت "آ" کا دل چاہا کہ وہ سورج کو پکڑ کر بجھا دے۔

سڑکوں پر صرف دن جاگتے اور گھروں میں صرف راتیں سوتی ہیں۔ ان کا گھر کوئی نہ تھا۔ اس لئے ان کی رات کوئی نہ تھی۔ ان کے پاس تو صرف سڑکیں تھیں سورج تھے۔ اور "س" سورج کی روشنی میں بول نہیں سکتا تھا۔

ایک بار "آ" نے خاموشی توڑتے ہوئے پوچھا۔ "س" کیا سوچ رہے ہو؟

"سوچ رہا ہوں۔ لڑکیوں کے ساتھ فلرٹ کروں اور تجھے دکھی۔"

شاید اسی طرح "آ" دکھی ہونے کے بجائے سکھی ہو جاتی۔ اس لئے وہ ہنس دی اور "س" بھی ہنس دیا۔ اور اس کے بعد ایک طویل خاموشی۔

کئی بار "آ" کے دل میں خیال آیا وہ ہاتھ بڑھا کر "س" کو اس خاموشی سے نکال باہر لائے وہاں تک جہاں تک دل کا درد ہے۔ لیکن وہ صرف اپنے ہاتھوں کو دیکھتی رہی۔ اس نے ہاتھوں کو کبھی کچھ نہیں کہا تھا۔

ایک بار "س" نے کہا "چلو چین چلیں......."

"چین"؟

"جائیں گے لیکن آئیں گے نہیں۔"؟

"لیکن چین کیوں---؟"

یہ کیوں شاید پام کے پیڑوں ایسا تھا۔ جس کے پتے پھر ہوا میں کانپنے لگے۔

اس وقت ''آ'' کا سر تکیے پر تھا۔ لیکن اسے نیند نہیں آرہی تھی ''س'' ساتھ والے کمرے میں شاید نیند کی گولی لے کر سویا پڑا تھا ''آ'' کو جاگتے رہنے پر غصہ آیا نہ ''س'' کے سونے پر ---- وہ صرف یہ سوچ رہی تھی۔ کہ وہ سڑکوں پر چلتے چلتے کبھی کبھی سڑکوں پر مل جاتے ہیں تو پل دو پل کے لئے ایک طلسمی گھر کیوں تعمیر ہو جاتا ہے۔ ''آ'' کو ہنسی آگئی۔ جلتی جوانی کے وقت تو اس طرح ہو ہی جاتا ہے۔ لیکن اب یہ کیوں کر ہو رہا ہے۔ آج پھر یہ کیوں ہوا۔

معلوم نہیں یہ کیا ہے جو عمر کی سڑک پر نہیں آرہا تھا۔ باقی رات معلوم نہیں کس وقت گزر گئی۔ دروازے پر آہستہ سے دستک دیتے ہوئے ڈرائیور نے کہا---- ایئرپورٹ پر جانے کا وقت ہوگیا ہے۔

''آ'' نے ساڑھی پہنی' سوٹ کیس اٹھایا۔ ''س'' بھی جاگ کر اس کمرے میں آگیا۔ وہ دونوں اس دروازے کی طرف بڑھے جو باہر سڑک کی طرف کھلتا تھا۔ ڈرائیور نے ''آ'' کے ہاتھ سے سوٹ کیس لے لیا۔ ''آ'' کو اپنے خالی ہاتھ اور خالی ہوتے محسوس ہوئے۔ وہ دہلیز پر چپک کر رہ گئی۔ پھر جھٹ سے اندر بیٹھک میں سوئی پڑی ماں کو خالی ہاتھوں سے آداب کہہ کر باہر کو آگئی۔

ایئرپورٹ کی طرف جانے والی سڑک کب شروع ہوئی اور کب ختم ہوئی۔ وہ دونوں گاڑی میں چپ چاپ بیٹھے رہے۔

اچانک ''س'' نے پوچھا۔ ''تم کچھ کہنا چاہتی ہو۔''

''---- نہیں'' ''آ'' نے جواب دیا۔ اور پھر ایک مسلسل خاموشی۔ ''آ'' کو محسوس ہوا شاید ''س'' کو بھی بہت کچھ کہنا اور بہت کچھ سننا تھا لیکن اب بہت دیر ہوگئی ہے۔ اس طرح اب سارے الفاظ زمین میں گڑھ کر پام کے پیڑ بن گئے ہیں اور دل کے سمندر کے کنارے ان پیڑوں کے پتے اس وقت تک کانپتے رہیں گے جب تک ہوا چلتی رہے گی۔ ایئرپورٹ آگیا۔ ''آ'' کے پاؤں کے نیچے ''س'' کے شہر کی سڑک کٹ گئی۔ اب سامنے ایک نئی سڑک تھی جو ہوا میں سے گزر کر ''آ'' کے شہر کی ایک سڑک کے ساتھ جا ملتی تھی۔ وہاں جہاں دو سڑکیں ایک دوسری کی بغل

سے نکلتی تھیں۔ "س" نے آہستہ سے "آ" کو اپنے شانوں سے لگا لیا۔ اور پھر وہ دونوں اپنے اپنے پاؤں کے نیچے زمین کو یوں دیکھنے لگے جیسے ان کو اس گھر کی یاد آ گئی ہو۔ جو ابھی بنا نہیں تھا۔۔۔۔

❀❀❀

اپنا اپنا قرض

وہ ایک ٹوٹی ہوئی بات ایسی تھی۔
کسی کو معلوم تھا کہ وہ کون تھی، کہاں سے آتی، کب آئی شاید کنواری تھی یا بیوہ۔ کیونکہ لفظ مرد کے نام کا اس جھونپڑی میں صرف کوئی دو برس کا ایک بچہ تھا۔ اس کا بھی ہو سکتا ہے اور دوسری کا بھی جو اس سے ذرا بڑی عمر کی تھی۔

نئی آباد بستی میں سب لوگ بھی نئے تھے۔ وہ بھی جو وہاں اپنے گھروں کی بنیادیں رکھ رہے تھے۔ اور وہ بھی جو یہاں اینٹوں اور چونے کو اکٹھا کر کے دیواریں کھڑی کر رہے تھے۔ معلوم نہیں پیڑوں کے نیچے بنی اس کی چائے کی جھونپڑی پیڑوں کی عمر کے برابر تھی یا کھدیں ہوئی بنیادوں کی عمر کی۔

لوگ صرف یہ جانتے تھے اس کا نام "مورتی" تھا اور اس کی جھونپڑی میں صبح سے شام پانچ بجے تک مزدوروں کی چھٹی ہونے تک دال چینی کی گرم چائے ملتی تھی۔ وہ اکثر موٹی ململ کی سرخ دھوتی باندھے چولہے میں جلتی لکڑیوں کے قریب بیٹھتی تو وہ بھی چولہے کی آگ کی طرح سلگ رہی ہوتی۔

اس سے بڑی عمر والی دھوپ نکلتے ہی بچے کو کھلانے کے لئے نیم کے پیڑوں کے نیچے آبیٹھتی۔ شام کو سردی بڑھنے لگتی تو بچے کو بکل میں لپیٹ کر جھونپڑی کے اندر چلی جاتی۔ چائے تو صرف مورتی بناتی اور کام کرتی تھی۔

راج بخش کے گھر کی جب چھتیں بن چکیں تو تعمیر کا کام کچھ دنوں کے لئے تھم گیا۔ لیکن بخشی صاحب ان دنوں باقاعدگی کے ساتھ آتے تھے۔ چوکیدار سے چائے والی جھونپڑی سے چائے منگواتے تھے۔ اور کچھ دیر وہاں اکیلے کرسی پر بیٹھے

رہتے ایک دن زیر تعمیر مکانوں کے چوکیدار اپنی اپنی جھونپڑیوں میں آگ جلا کر کھانے کے لئے کچھ پکا رہے تھے۔ جس وقت انہوں نے چوکیدار کو چائے لانے کے لئے بھیجا تو مورتی کی جھونپڑی میں چائے کے برتن دھوئے جا چکے تھے۔ مورتی نے نئے سرے سے چائے کا پانی رکھا۔ چوکیدار شاید ان کے لئے سگریٹ لینے چلا گیا تھا۔ مورتی چائے بنا کر انتظار کرنے لگی۔ پھر خود ہی جا کر بخشی صاحب کو چائے دے دی۔

نیم کے پیڑوں سے جھڑتے پتے زمین پر کچھ اس طرح سرسرا رہے تھے۔ جیسے مٹی کو کھود کھود کر اپنی جڑیں ڈھونڈ رہے ہوں----

راج بخشی نے چائے کی پیالی پکڑتے ہوئے مورتی کی طرف دیکھا۔ لیکن پھر نظریں ایک طرف ہٹا لیں۔ تب بھی اس کی آنکھوں میں اتر کر وہ اب تک مورتی کے چہرے پر لرز رہا تھا۔

وہ چائے پی رہے تھے۔ مورتی ایک فاصلہ پر شام کے سمٹے اجالے میں کھڑی رہی-- مورتی" اچانک ان کی آواز یوں آئی جیسے ہوا کے ایک جھونکے کے ساتھ نیم کے پیڑوں سے بہت سے پتے ٹوٹ کر گر پڑے ہوں۔

"جی، معلوم نہیں کیوں، مورتی کو محسوس ہوا جیسے اس کی آواز پیپل کے پتے کی طرح کانپ گئی تھی۔ شاید ان تک پہنچ بھی نہ سکی یعنی ہونٹوں میں ہی دب گئی تھی۔ تو یہاں کب سے اور کس طرح آئی ہو۔؟"

مورتی نے دور خلاء میں دیکھا۔ اس حد تک جو اس کی آنکھوں کی رسائی سے باہر تھا۔ پھر کہا قافلے کے ساتھ جب سب لوگ آئے تھے۔

راج بخشی نے آنکھ بھر کر اس کی طرف دیکھا۔ شام کے وقت وہ کانسی کی مورتی کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔

ان کو خیال آیا۔ پچھلے برس اس دھرتی کی تقسیم۔ ایک اور غزنوی کی طرح آئی تھی۔ جس نے معلوم نہیں کتنی مورتیاں توڑ ڈالی تھیں۔ اور یہ ایک مورتی معلوم نہیں کیسے مندر سے اٹھا کر یہاں ایک جھونپڑی میں لا کر رکھ دی تھی۔

لیکن ساتھ ہی راج بخشی کو ڈوبتے سورج کی سرخی کی طرح ایک تیکھا احساس ہوا۔ لوگ ہمیشہ اپنے خاندانی کاروبار اور رہائش ایسی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں۔ یہ سب چیزیں جب ان سے چھن جائیں ان کے چہرے بھی گم ہو جاتے ہیں۔ پچھلے برس انہوں نے کئی گروہ اور قافلے دیکھے تھے۔ اپنی اپنی حیثیت کے بغیر لوگوں کے اپنے اپنے چہرے بھی چھنے ہوئے تھے۔ سب ایک ساتھ بھٹی میں پگھل کر ایک جیسے ہوتے محسوس ہوئے۔ چہرے بھی آوازیں' خیالات بھی لیکن وہ مورتی کی طرح ثابت کی ثابت رہی۔

راج بخشی کو مورتی کا گھر بار یا اس کی کوئی حیثیت معلوم نہیں کی تھی۔ لیکن یہ احساس تھا کہ وہ جو بھی تھی' وہی تھی' اس کی اپنی مندر یا محل میں رہنے والی ادا یہاں اس جھونپڑی میں بھی ہے۔

مورتی اسی طرح ایک فاصلے پر کھڑی تھی۔ چائے کی پیالی اسی طرح بخشی کے ہاتھوں میں پکڑی ہوئی تھی۔ شاید وہ خالی پیالی لینے کے لئے کھڑی تھی۔ لیکن آگے بچھی ہوئی خاموشی کو وہ توڑ نہیں سکتی تھی' اور نہ ہی بخشی۔

پھر اچانک چوکیدار کے پاؤں کی چاپ نے اس خاموشی کو توڑ دیا۔ راج بخشی نے خالی پیالی چوکیدار کو پکڑا دی اور چوکیدار نے مورتی کو۔ واپس جھونپڑی کی طرف لوٹتی مورتی کو چوکیدار نے دو آنے پکڑا دیئے۔ وہ کانچ کی پلیٹ میں اس طرح چھنکے جیسے دو ٹکڑیوں میں بٹی ہوئی خاموش سے ٹوٹ کر کچھ کنکریں بھر گئیں ہوں۔

راج بخشی اگلے دن آئے اور پھر اس کے اگلے دن۔ انہوں نے خود جھونپڑی کے قریب جاکر چائے مانگی' پی اور دو ٹکڑیوں بٹی ہوئی خاموشی پھر ایک ثابت ٹکڑا محسوس ہونے لگی۔

کچھ آوازیں ایسی ہوتی ہیں۔ جو خاموشی کے بدن میں اتر کر رگوں کی طرح چلتی ہیں۔ اور ان کے ساتھ خاموشی بڑی جیتی جاگتی محسوس ہوتی ہے ایک دن چائے بنائے مورتی کے قریب کھیلتے بچے کی آواز بھی ایسی تھی۔

"یہ بچہ"؟

"میرا بچہ ہے"

یہ سوال اور جواب بھی خون کی حرکت ایسا تھا۔ سرد خاموشی کچھ سلگتے رنگوں ایسی ہوگی "اور وہ ـــ؟ راج بخشی نے اندر جھونپڑی میں بیٹھی ہوئی عورت کی طرف دیکھا۔ جواب میں مورتی نے پہلے بچے سے کہا۔ جاؤ اندر اپنی ماں کے پاس" پھر بخشی صاحب کو کہا۔ وہ میرے بچے کی ماں ہے"

خاموشی جیسے زور سے دھڑکنے لگی۔

اگلی دن راج بخش کے کانوں میں مورتی کی آواز پتوں کی سائیں سائیں کی طرح چلتی رہی۔ انہوں نے اس کی جھونپڑی سے روز چائے پی۔ لیکن مزید کچھ نہ پوچھا۔ مورتی کے لفظ سادہ تھے "یہ میرا بچہ ہے" وہ میرے بچے کی ماں ہے" لیکن معنی صرف پتوں کی سائیں سائیں ایسے تھے جو پکڑ میں نہیں آتے تھے۔

یہ نئی نئی بستی قدیم شہر سے آٹھ میل دور تھی۔ اس کے قریب ابھی کوئی منڈی بازار نہیں بنا تھا۔ شہر سے اس بستی تک صرف ایک بس چلتی تھی۔ لیکن تمام دن میں شاید تین بار ـــ یہ بس کھو جائے تو آٹھ میل کا سفر پیدل تھا۔ چلنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ اس راہ پر ایک دن راج بخشی نے شہر سے بستی کی طرف آتے مورتی کو دیکھا مورتی نے دونوں ہاتھوں میں کچھ گٹھڑیاں اٹھا رکھی تھیں۔

راج بخشی نے اپنی گاڑی روک لی۔

"بس دو منٹ کا فرق پڑ گیا تھا۔ کہ بس چھوٹ گئی" مورتی نے گاڑی میں گٹھڑیاں اور پوٹلیوں کو رکھتے ہوئے کہا۔ چائے کی پتی' چینی اور کچھ ضروری سودا سلف لینے شہر جانا پڑتا ہے۔

راج بخشی نے گاڑی پہلے سے دوسرے' دوسرے سے تیسرے گیئر میں ڈالتے ہوئے آہستہ سے کہا "بہت محنت کرنی پڑتی ہے۔"

شام کی چلتی ہوا کی طرح مورتی ہنس پڑی "کچھ نہیں کہا"

"مورتی' تیرے بچے کا باپ' راج بخشی کے منہ سے ادھورا سا فقرہ نکلا جو ان کو کچھ غلط سا بھی لگا۔ پھر اس فقرے کو کچھ درست کرتے ہوئے انہوں نے کہا'

تیرا خاوند وہاں فسادات کے دنوں میں----

"ہاں" فسادیوں نے مار ڈالا تھا۔

اگلی خاموشی میں پھر اس دن والی مورتی کے لفظ راج بخشی کے کانوں میں سائیں سائیں کرنے لگے---- کچھ دیر بعد وہ کہنے لگے لوگ عجیب باتیں کرتے ہیں۔"

"میری باتیں؟" مورتی نے پوچھا لیکن آواز میں فکر ایسا کچھ نہ تھا۔

وہ دوسری عورت----؟

اس کا نام رکمنی ہے' وہ میری رکی بھین ہے۔"

"وہ بچہ اس کا ہے"؟

"ہاں"

تیرا نہیں----؟

"میرا بھی۔"

راج بخشی ہنس پڑے' زیادہ کس کا ہے؟

"زیادہ اس کا ہے----" مورتی بھی تھوڑا سا ہنس دی۔

راج بخشی لمحے کی خاموشی کے بعد گھمبیر لہجے میں کہنے لگے۔ اصل میں تمہارے دونوں میں ایک کو عورت ہونا چاہئے تھا ایک کو مرد۔

"ہاں" لیکن تمہاری جگہ یہ خیال خدا کو آنا چاہئے تھا۔

مورتی کا جواب پا کر راج بخشی نے تھوڑا سا چونک مورتی کی طرف دیکھا۔ پھر کہنے لگے۔ تمہیں معلوم ہے لوگ کیا کہتے ہیں؟

"کیا؟"

ایک دن میرے ٹھیکیدار کا منشی کسی کو بتا رہا تھا----

کیا؟

کہ تجھے دوبارہ بیاہ کرنے میں کوئی تردد نہیں۔ اگر ایسا ہے تو----" راج بخشی اس "تو" سے آگے کچھ نہ کہہ سکے۔

مورتی نے کہا۔ لوگ ٹھیک کہتے ہیں۔ میں نے ہی کہا تھا۔ اگر کوئی میرے اور رکی کے دونوں کے ساتھ شادی کرے تو میں کر سکتی ہوں۔"

"عجیب شرط ہے۔"

نہیں عجیب نہیں' مورتی سامنے خالی سڑک کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر کہنے لگی' صاحب ابھی آپ نے کہا تھا۔ ہم دونوں میں--- رکی اور مجھ میں ایک کو عورت ہونا چاہئے تھا۔ ایک کو مرد۔ یہ سچی بات کہی تھی۔ مجھے رکی ایسا مرد چاہئے تھا۔

لیکن اس وقت تو تو اس کے لئے کام کرتی ہو' کماتی ہو اس کے مرد کی طرح---- اور میں مرد نہیں---- مرد کی جگہ ہوں۔ مرد کی طرح----"

راج بخشی نے سوچا نہیں تھا کہ مورتی کے ساتھ باتیں کرکے وہ اس قدر حیران ہوں گے۔ ہنس دیئے جیسے ہنسی کے ساتھ حیرانی کے ڈھانپ رہے ہوں۔ مورتی نے کہا۔ اصل میں مرد نہ اسے ملا نہ مجھے اس کا شوہر بھی فسادات کے دنوں میں----

وہی جسے فسادیوں نے مار دیا۔

"مورتی! راج بخشی جھڑتے ہوئے پتوں والی ٹہنی کی طرح خالی خالی سے مورتی کی طرف دیکھنے لگے---- پھر کہنے لگے۔ وہ خاوند تیرا بھی اور اس کا بھی---؟ یہ بچہ تیرا بھی اور اس کا بھی--

ہاں صاحب' مورتی ہنس پڑی' خدا ایک بات بھول گیا اور پھر بھولتا ہی گیا۔

راج بخشی نے گاڑی کو آہستہ کیا اور کہا۔ بستی آنے والی ہے مورتی--- اگر تجھے اعتراض نہ ہو تو میں کچھ دیر کے لئے گاڑی روک لوں؟

مورتی کی خاموشی---- بخشی صاحب کی طرح مورتی کو بھی مشکل لگی۔ کہنے لگی "ہاں صاحب' میں نے سنا ہے آپ اچھے آدمی ہیں۔

"اور کیا سنا ہے؟" راج بخشی نے گاڑی کو روکتے ہوئے پوچھنے لگے۔ اور---- وہ یہ کہ آپ کا کوئی بچہ نہیں----

بچے کی ماں بھی نہیں، راج بخشی ہنس دیئے۔
"ہاں کوئی بھی نہیں"
"کہاں سے سنا تھا۔"
آپ کے ٹھیکیدار اور چوکیدار سب مجھ سے چائے پینے آتے ہیں' وہ یہ باتیں کرتے ہیں۔
"وہ یہ باتیں بھی کرتے ہیں؟"
صرف اس دن کر رہے تھے۔ جس دن آپ کے گھر کی بنیادیں رکھی گئی تھیں۔ آپ نے اس دن نہ شگن کیا نہ موتی چور لڈو بانٹے' سب لوگ آپ کی عزت کرتے ہیں۔ وہ سوچتے ہیں آپ اکیلے ہیں اس لئے آپ کو مکان بنانے کی کوئی خوشی نہیں۔
راج بخشی بہت دیر تک خاموش رہے' محسوس ہوا۔ ان میں اور مورتی میں باتیں کرنے والی سڑک ٹوٹ گئی تھی۔ لیکن یہ سڑک شاید وہ نہیں جو راج بخشی کا اپنی زندگی کی طرف رخ موڑتی تھی وہ اوپر سے لوٹ کر دوسری طرف دیکھنے لگے۔ جو مورتی کی طرف جاتی تھی۔ کہنے لگے اچھا مورتی وہ دوسری عورت ر کی مرد نہیں تھی۔ اس لئے تجھے کسی اور کے ساتھ بیاہ کرنا نہیں پڑا۔
"ہاں صاحب" مورتی ہنس پڑی۔ اس کی میری قسمت ایک تھی۔ اس لئے ہمارا بیاہ بھی ایک مرد کے ساتھ ہوا۔ اور ہمارا بچہ بھی ایک ہی ہے۔
باہر بارش کی بوندیں برسنے لگیں۔ راج بخشی نے دھندلی ہوئی ونڈ سکرین کی طرف دیکھا' وائپر چلایا اور کہنے لگے "دونوں کا بیاہ تو ایک آدمی کے ساتھ ہو سکتا ہے لیکن بچہ کس طرح؟
روح اور بدن میں اتنا فرق ہوتا ہے صاحب" بس سمجھ لو روح صرف اس کی تھی اور بدن صرف میرا۔
"شاید ہو-----" اس کچھ راج بخشی نے کہا' پھر کتنی دیر خاموش رہے۔ اچانک کہنے لگے۔ اس وقت ایک آدمی کے ساتھ بیاہ کرنا شاید کوئی مجبوری تھی یا

ضرورت لیکن اب کیوں؟ اب بھی ضرورت ہے' وہ نہیں' لیکن ضرورت ہے۔
وہ کیسی ضرورت تھی۔۔۔۔؟
ضرورت صرف پیسے کی تھی' وہ آدمی بہت امیر تھا' اس کے کئی بھٹے تھے۔
لوگ کہتے تھے اس کے بھٹے میں مٹی کی نہیں سونے کی اینٹیں پکتی تھیں۔
"پھر؟"
اس کی پہلی بیوی رکی تھی۔ نہیں پہلی نہیں' پہلی مر چکی تھی شاید اسے نکال باہر کیا تھا۔ دیکھی نہیں لیکن سنا ہے وہ خوبصورت نہیں تھی۔
"خوبصورت نہیں تھی اس لئے مر گئی؟" راج بخشی ہنس پڑے۔
ہاں صاحب آدمی کو دھتکارتے رہو وہ مردہ سا ہو جاتا ہے' اور کبھی تو مر بھی جاتا ہے۔
پھر۔۔۔۔؟
"پھر اس نے رکی کے ساتھ بیاہ کیا' رکی بہت خوبصورت تھی لیکن کئی برت بیت گئے۔ رکی کے بچہ نہیں تھا۔؟"
"ہاں صاحب لوگ کہتے ہیں بھٹوں والوں کو پہلی کا سراپ لگا ہوا تھا۔ کہتے ہیں جب وہ مری تھی تو وہ امید سے تھی۔ لیکن اس آدمی نے ایک دن اسے اتنا پیٹا کہ وہ اور اس کا بچہ۔ مورتی پرانی یادوں کے جھونکے سے لرز گئی۔
"اس نے بچے کی خاطر پھر تم سے بیاہ کیا؟"
ہاں صاحب بچے کی خاطر' میرے ماں باپ سے اس نے ایک طرح سے مجھے قیمت دے کر خریدا تھا۔ آخر وہ سراپ ٹوٹ گیا۔۔۔۔؟"
نہیں۔۔۔۔ ہاں" مورتی کی آواز تھرک گئی۔ پھر وہ تھرکتی آواز کو سہارا دیتے ہوئے پوچھنے لگی۔ لیکن صاحب آپ یہ سب باتیں کیوں پوچھ رہے ہیں۔ میں آپ کو یہ سب کچھ۔۔۔۔ یہ سب کچھ کیوں کر بتاؤں۔
راج بخشی ایک ٹک مورتی کے چہرے کی طرف دیکھا اور پھر کہنے لگے۔ میں تجھے چھ ماہ سے دیکھ رہا ہوں۔ معلوم نہیں کیوں۔۔؟ میں یہاں روز صرف مکان کی

خاطر نہیں آتا---- شاید----شاید---- راج بخشی کا دائیاں ہاتھ کھڑی گاڑی کے سٹیرنگ کے ویل پر تھا' اس نے بایاں ہاتھ مورتی کے کندھے پر رکھتے ہوئے پوچھا- "میں تجھ سے شادی کر سکتا ہوں---؟"

"صاحب آپ؟" مورتی کے سوال میں جتنی حیرانی تھی آواز میں اتنی نہیں تھی- پھر وہ آہستہ سے کہنے لگی- اپنے پر زور ہوتا لیکن سپنوں پر زور نہیں ہوتا- میں نے تین بار صبح اٹھ کر اپنے آپ کو جھڑکا تھا مجھے تین راتیں صاحب آپ کا سپنا آتا رہا----

"مجھے صاحب نہ کہو کچھ اور کہا کرو-

"مورتی خاموش رہی"

اچھا یہ بتاؤ- اگر میں اس طرح سوچوں تو تو میرے لئے بھی یہی شرط لگاؤ گی' وہ رکی والی؟"

"ہاں"

راج بخشی نے مورتی کے کندھے سے ہاتھ اٹھا لیا- وہ ہاتھ بھی سٹیرنگ ویل پر رکھ دیا- باہر بارش تیز ہو گئی تھی' ونڈ سکرین پر دھند گہری ہوتی جا رہی تھی' لیکن وائپر پورے زور کے ساتھ دھند کو صاف کرتا رہا-

صاحب---- بخشی صاحب"---- بات یہ ہے جہاں میں رہوں گی وہاں رکی- جس حال میں میں اسی حال میں وہ----" مورتی کہہ رہی تھی---- بخشی صاحب نے بات کاٹی' اس میں کوئی انکار نہیں وہ پورے سکھ اور آرام سے رہے گی-

مورتی ہنس دی "کس طرح----؟"

بخشی صاحب کو مورتی کا "یہ کس طرح-" بے معنی معلوم ہوا- لیکن کہنے لگے' پوری عزت اور احترام کے ساتھ- گھر میں ماں' بھین کی طرح----!

مورتی نے سامنے ونڈ سکرین کی طرف دیکھا' وائپر چل رہا تھا- پھر بھی ہتھیلی کے ساتھ اس کی دھند کو پونچھتے ہوئے کہنے لگی' بس یہ ہی بات ہے بخشی صاحب-

وہ گھر میں ماں کی طرح رہے گی تب ماں نہیں ہوگی۔ صرف ماں کی طرح ہوگی۔ بھین نہیں ہوگی' بھین کی طرح ہوگی۔ یہ "کی" زیادہ دیر نہیں چلتا----

راج بخشی کو محسوس ہوا' اس وقت شاید مورتی کے کندھے کو اس کے ہاتھ کی ضرورت نہیں۔ لیکن ان کے ہاتھوں کو مورتی کے کندھے کی ضرورت تھی۔ ان کا بایاں ہاتھ کچھ کانپ رہا تھا۔ جو مورتی کے کندھے پر رکھ دیا' مورتی کہنے لگی' لیکن جب کوی عورت کسی کی بیوی ہوتی ہے۔ وہ بیوی ہوتی ہے بیوی کی طرح نہیں ہوتی----

"ہاں مورتی----' راج بخشی نے دلیل مان لی۔ لیکن کہا' مجھے زندگی میں پہلی بار بھی جو کچھ ملا اس کے ساتھ بانٹنا پڑا۔ دوسری بار تو جان بوجھ کر----؟"

یہ کسی عورت کے لئے ممکن نہیں ہوتا۔ نہیں نا----؟

"نہیں"

لیکن اس نے جو کچھ میرے ساتھ بانٹا تھا وہ بھی ممکن نہیں تھا۔

"وہ مجبور تھی"

ایک سوتن کہلانے والی عورت جو کچھ بانٹتی ہے' میں اس کی بات نہیں کرتا۔

"پھر؟"

مورتی دیر تک خاموش رہی جیسے کچھ کہنے یا نہ کہنے کا اپنے ساتھ فیصلہ کر رہی ہو۔ پھر ایک بار اس نے آنکھ بھر کر بخشی صاحب کے چہرے کی طرف دیکھا' محسوس ہوا۔ ان کے چہرے پر کچھ اس طرح کا سچ تھا۔ جو اس نے کبھی پہلے کسی مرد کے چہرے پر نہیں دیکھا۔ سوچ لیا کہ اس کا اپنا سچ کیسا بھی تھا۔ لیکن اسے سچ کے بدلے صرف سچ دینا تھا۔

کہنے لگی "میرے لئے ٹھٹھوں والوں کی مانگ کتنے عرصے سے تھی۔ ماں باپ غریب تھے لیکن اتنے نہیں کہ مجھے بیچے بغیر ان کی گزر نہیں تھی۔جو جوان لڑکا مجھے پسند تھا۔ اس نے میرے ساتھ بیاہ کرنے کا وعدہ کیا ہوا تھا میں غریب تھی' لیکن

جوان تھی۔ مورتی نے کڑوی ہنسی کا گھونٹ بھرا اور پھر کہنے لگی' اسی دن سے مجھے اس سے چڑ ہو گئی۔

راج بخشی خاموش تھے۔ مورتی نے بھی چپ سادھ لی' پھر کہنے لگی یہ ہماری عورتوں کی زبان سمجھ رہے ہو نا۔؟

راج بخشی نے مثبت میں سر کو جنبش دی۔ مورتی کہنے لگی' لیکن جب اسے معلوم ہوا کہ وہ شادی سے انکار کر گیا۔ سو کسی مرد کا بدلہ کسی مرد سے لینے کے لئے میں نے ماں باپ کو کہہ دیا کہ میں بھٹوں والوں کے ساتھ شادی کروں گی۔

"سو یہ بچہ؟"

بھٹوں والوں کا نہیں' آپ نے پوچھا تھا۔ آخر اس کا سراپ ٹوٹ گیا۔ تب میرے منہ سے نکلا تھا۔ نہیں' بعد میں ہاں کہا تھا۔ لیکن پہلے سچ ہی منہ سے نکلا تھا۔ اس بات کا رکی کو معلوم ہے۔"

صرف اسی کو معلوم ہے اور کسی کو نہیں۔

لیکن اس نے---- راج بخشی سوچنے لگے اگر رکی کا اس وقت مورتی کے ساتھ جو رشتہ تھا۔ اس کا مورتی کو ہر طرح سے بچائے رکھنا سچ مچ ممکن نہیں تھا۔ مورتی کہہ رہی تھی---- اس بچے کو میں نے ماں کے دل کی پوری نفرت کیساتھ جنم دیا تھا۔ پر رکی نے دل کی تمام تر گہرائیوں سے اسے پالا۔ اس وقت تک رکی کو کچھ معلوم نہ تھا۔ وہ بنیادی طور پر اچھے دل کی ہے۔ وہ اپنے بدن کی حسرت میرے بدن میں پورا کر رہی ہے۔ مورتی کی آواز باہر دور بارش کی بوندوں میں بھیگ گئی۔

"پھر؟"

وہ کمینہ جس کا یہ بچہ تھا' اور بھی کمینگی پر اتر آیا۔ مجھ دھمکا کر اس نے دوبارہ مجھ سے پانچ پانچ سو روپے لئے۔ میں نے تنگ آکر سوچا اگر میں بھی مر جاؤں تو اس بچے کو بھی زندہ نہیں رہنے دوں گی۔ اس کی پھر دھمکی آئی تھی۔

میں پاگل سی ہو گئی تھی۔ ایک رات بچے کو اٹھایا اور اندھیرے میں باہر کنویں کی طرف دوڑ پڑی۔ بچہ رکی کے ساتھ سوتا تھا۔ سوتے ہوئے بچے کو اٹھایا تو

رکی بھی جاگ پڑی- یہ سب مجھے اس وقت معلوم ہوا جب وہ میرے تعاقب میں کنویں تک آ پہنچی وہاں میں نے اسے سب کچھ بتا دیا- لیکن وہ مجھے گلے سے لگا کر واپس لے آئی-

اس نے اس آدمی کو کچھ نہیں بتایا-

راج بخشی حیران تھے-

بالکل نہیں اسے بچے سے سچ مچ بہت پیار تھا' صرف اتنا نہیں' چوری چھپے اسے بلاوا بھیجا' جو مجھے آئے دن دھمکاتا رہتا تھا- وہ اسے کہنے لگی بھٹوں والوں کو سب کچھ معلوم ہوگیا ہے سو دھمکی کا کوئی فائدہ نہیں بلکہ بھٹے والوں نے تمہیں مار ڈالنے کے تمام بندوبست مکمل کر لئے ہیں سو اگر تم جان کی امان چاہتے ہو تو ادھر کا رخ نہ کرنا-

راج بخشی کی آنکھوں میں پانی بھر آیا- انہوں نے جھونپڑی کی مدھم لو میں بیٹھی رکی کو دور سے دیکھا ہوا تھا- آنکھوں میں اس کی پہچان نہیں تھی وہ مورتی کی طرف دیکھنے لگا اسے محسوس ہوا مورتی کے چہرے پر جو ایک روشنی تھی وہ صرف اس کی جوانی کی نہیں تھی وہ اس رکی کی بھی تھی- جسے اس نے دیکھا نہیں تھا-

مورتی کہہ رہی تھی' یہ بچہ سچ مچ اس کا ہے- میرا تو ایسے ایک بہانہ ہے-"

راج بخشی کی ہتھیلی مورتی کے کندھے پر سخت ہوگئی- مورتی کہنے لگی مجھے معلوم ہے میری عمر چھوٹی ہے- اس لئے لوگ میری طرف دیکھتے ہیں لیکن اب جو حق اسے نہیں ملا وہ میں نے نہیں لیا-

راج بخشی بہت دیر تک خاموش رہے- پھر ہاتھ کی ہتھیلی سے مورتی کے چہرے کو اپنی طرف کرکے کہنے لگے" تجھے بھی زندگی کا ایک قرض اتارنا ہے اور مجھے بھی زندگی کا ایک قرض چکانا ہے-

مورتی خاموش بڑے دھیان سے ان کی طرف دیکھتی رہی- راج بخشی ایک گہرا سانس لے کر کہنے لگے مجھے اپنے سگے بھائی کا قرض اتارنا ہے- مجھے اچھی طرح ہوش بھی نہیں جب میری بھابی نے میرے ساتھ تعلق جوڑ لیا تھا- میں بہت انجان

تھا- کچھ بھی نہیں سمجھا- صرف بدن جلتا رہا- اور میں دن بدن بجھتا رہا-

مورتی معلوم نہیں یہ سب کچھ سمجھ رہی تھی کہ نہیں- راج بخشی نے دھیان سے اس کی طرف دیکھا' پھر کہا اس کی جس برس شادی ہوئی تھی- اسے اس برس کوئی مرض ہوا تھا- یہ بات مجھے برسوں بعد معلوم ہوئی لیکن اسے اس وقت سے معلوم تھا اور اس نے بچے کی آس کھلونے کی طرح توڑ دی تھی- بہت چھوٹے گھر سے آئی تھی- سب کچھ اپنے پاس رکھنے لئے سوچتی رہتی کہ میں بھی اس کے بس میں رہوں- میں کئی برس کی رکی ہوئی گھڑی سے وقت دیکھتا رہا- میں سمجھتا نہیں- بھائی کا دکھ بھی دیکھا- لیکن سمجھا نہیں---- میں اپنے بھائی کا بہت بڑا قرض دینا ہے- مورتی----

مورتی---- جو کانسی کی مورتی کی طرح دکھائی دیتی تھی- ہڈیوں اور گوشت کی عورت کی طرح لرز گئی- راج بخشی کہہ رہے تھے- اب اس کے ساتھ کوئی واسطہ نہیں- لیکن میرے بھائی کا شک اسی طرح ہے میں بیتے ہوئے برس واپس نہیں لا سکتا- لیکن آگے- آگے--؟ مورتی کے ہونٹ آہستہ سے ہلے-

بارش کی بوچھاڑ سے چاروں اور دھند پھیلی ہوئی تھی- راج بخشی گاڑی کے اندر کی مدھم روشنی میں مورتی کے چہرے کی طرف دیکھ رہے تھے- پھر کہنے لگے- آؤ-- مورتی---- آؤ اپنے اپنے قرض اتاریں-

"آپ----" مورتی ان کی طرف دیکھتی کچھ حیران سی اپنے طرف دیکھنے لگی- جیسے اپنے آپ کو ان کی آنکھوں سے دیکھ رہی ہو-

راج بخشی نے ہاں' میں سر کو ہلایا- مورتی کے لئے شاید اب بھی ایک بار اور "ہاں" کرنے کی ضرورت تھی- منہ سے نکلا اور رکی بھی----؟

راج بخشی نے مورتی کے ماتھے کے قریب سر جھکا کر اس کے ماتھے کو یوں چوما کہ مورتی کو محسوس ہوا---- ان کی "ہاں" اس کے یقین کے برابر ہو گئی ہے-

وہ دوسرا

چمپا ہر شاخ پر کھلا ہوا تھا۔

ہر شاخ کنو کے سر سے اونچی تھی' ایڑیاں اٹھانے پر بھی اس کے ہاتھ کسی شاخ تک نہ پہنچ رہے تھے۔

کنو کو یاد آیا "ماں کہا کرتی تھی۔ کنو تو بھی اتنے برس کی ہو جتنے برس کا یہ چمپا کا بوٹا ہے" کنو سوچنے لگی: پھر یہ میرے برابر کیوں نہیں' میں تو چھوٹی ہوں لیکن یہ بوٹا کس طرح اتنا بڑا ہو گیا۔

گھر کی بیرونی دیوار بوٹے سے چھوٹی تھی۔ کنو کو خیال آیا۔ اگر وہ دیوار پر چڑھ جائے تو وہاں سے شاخ تک ہاتھ ڈال کر پھولوں کے گچھے کو توڑ سکتی ہے اور وہ دیوار پر چڑھنے کے لئے پاؤں کے نیچے چھوٹے چھوٹے پتھر جوڑنے لگی۔ پتھروں کا ایک ڈھیر بنا کر کنو بمشکل دیوار تک پہنچ سکی۔ لیکن دیوار پر نہ چڑھا جا سکا......

سری کرشن گھر کے بیرونی دروازے میں سے گزرتے ہوئے جس وقت دائیں طرف کی دیوار کے ساتھ کنو کو لٹکتے دیکھا۔ اس سے نہ اوپر چڑھا جا رہا تھا اور نہ نیچے اترا جا رہا تھا۔ شری کرشن نے دوڑ کر کنو کو دیوار سے الگ کیا۔ پھر بانہوں سے اٹھا کر اسے اونچا کیا تو کنو نے ایک شاخ سے پھولوں کا ایک گچھا توڑ لیا۔ گچھے کی ڈنڈی کو اطمینان کے ساتھ کنو نے مٹھی میں پکڑ لیا اور سری کرشن کی بانہوں میں پھیلتی ہوئی پوچھنے لگی۔ انکل ماما کہتی ہیں اس چمپا کے بوٹے کی عمر میری عمر کے برابر ہے پھر میں اس سے چھوٹی کیوں ہوں؟

شری کرشن کو معلوم تھا کنو خوش دلی سے دودھ نہیں پیتی۔ اس کی ماں جب

بھی اس کے لئے گلاس میں دودھ ڈالتی ہے کنو آنکھ مچولی کھیلنا شروع کر دیتی ہے وہ کبھی دروازے کی اوٹ میں چھپ جاتی ہے اور کبھی چارپائی کے نیچے۔ اس لئے شری کرشن نے کہا' بچے آم کے پیڑ ہوتے ہیں۔ آہستہ آہستہ بڑھتے ہیں' اگر وہ دودھ پئیں تو بہت جلد بڑے ہو جاتے ہیں۔

کیا آم کا پیڑ دودھ پیتا ہے؟ کنو نے دوبارہ پوچھا۔

شری کرشن نے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے اسے اندر کمرے کی طرف لے جاتے ہوئے کہا "میں تجھے ایک تصویر دکھاؤں گا' آم کے بیٹے کی۔ وہ جب دودھ پینے لگا تو بہت جلد بڑا ہو گیا۔۔۔۔"

آج میں دودھ پیوں گی'۔۔۔۔ کنو' شری کرشن سے ہاتھ چھڑا کر کمرے کی طرف اس طرح دوڑی جیسے اسے آج زندگی کا ایک راز مل گیا ہو۔

ڈرائنگ روم میں میز پر وہ گلدان آج بھی پڑا ہوا تھا۔ جس میں کنو کی ماں ہر صبح پھول سجاتی تھی۔ اب اس میں چھ ماہ سے کبھی کوئی پھول نہیں سجایا گیا تھا۔ کنو جب میز کے قریب کھڑی ہو کر۔ ہاتھ میں پکڑے پھول گلدان میں سجانے لگی تو اس نے دیکھا۔ اس کی ساری ہتھیلی پر دودھیا پانی لگا ہوا ہے اور پھولوں کے ڈنڈی میں سے ابھی تک پانی برس رہا ہے۔

"ماما پھول روتے ہیں۔۔۔۔؟" کنو نے ہاتھ کا گچھا میز پر رکھ دیا اور قریب ایک کرسی پر بیٹھی ہوئی ماں کی طرف دیکھا۔

ماں نے ایک بار کنو کی طرف دیکھا۔ ایک بار پھولوں کے گچھوں کی طرف پھر ایک درد سے آنکھیں بند کر لیں۔

شری کرشن کنو کے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ اس کے پاؤں کی آہٹ سنائی دی تو کنو کی ماں نے اپنی بند آنکھیں کھول دیں۔ اس نے کرسی پر شری کرشن کو بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود نڈھال سی اپنی کرسی میں دھنس گئی اور آہستہ سے بولی "ایک تو خدا مارتا ہے۔۔۔۔ دوسرا بچوں کی باتیں۔۔۔۔ یہ پھول توڑ کر لائی ہے اور کہہ رہی ہے۔ ماما پھول روتے ہیں۔

ماں کی آواز بھرا گئی لیکن شری کرشن نے چھ ماہ سے گھر کے اندر اور باہر پھیلے سوگ کو آج سمیٹ کر تھاما اور کہا "کنو" ماما کو وہ بات نہیں بتائی؟

کون سی۔۔۔۔؟ ایک بار کنو نے کہا' پھر خود ہی یاد کرتی ہوئی کہنے لگی۔ ماما انکل کہتے ہیں بچے آم کے پیڑ ہوتے ہیں اگر وہ دودھ پئیں تو بہت جلد بڑے ہو جاتے ہیں۔ میں بھی دودھ پیو گی۔

ماں کے ہونٹ تھوڑا سا کھلے' اس نے کنو کی طرف دیکھا اور پھر شری کرشن کو اس انداز سے تکا' جیسے کہ اس احساس کو اس نے اپنی آنکھوں میں بھر لیا ہو۔ "میں تیرے لئے دودھ لائی؟" ماں نے بدن کے حصوں کو سمیٹتے اپنی کرسی سے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں اور پھولوں کے لئے پانی بھی۔" کنو کہہ رہی تھی۔

جس وقت شری کرشن نے کہا چلو کنو پانی ہم خود لاتے ہیں اور ساتھ گلدان بھی دھو لیں گے ماں جاتے جاتے دہلیز میں اٹک کر رہ گئی۔ اس نے ایک پیچھے دیوار سے لگی ہوئی کنو کے باپ کی تصویر کو دیکھا' اور پھر اپنی زندگی کے ٹوٹے ہوئے درخت کی طرف۔ اور پھر کنو کی طرف دیکھنے لگی جیسے وہ شاخ سے ٹوٹے ہوئے پھولوں کی طرف دیکھ رہی ہو۔

کنو نے میز پر سے پھولوں کا گچھا پکڑ لیا' اور شری کرشن نے وہ گلدان جس کے ساتھ پچھلے چھ ماہ سے پھولوں کی قسمت روٹھی ہوئی تھی۔ رسوئی کی دیوار سے لگے۔ بیرونی نل سے دھو کر اس میں پھول سجا دیئے تو اسے یوں لگا جیسے شری کرشن سچ مچ مہربان پانی ہے جس کے ہونے سے شاخ سے ٹوٹا ہوا پھول بھی دو گھڑی کے لئے مسکرا سکتا ہے۔

کنو کے لئے دودھ گرم کرنے اور شری کرشن کے لئے چائے کی پیالی بنانے لگی تو چولہے پر رکھے پانی کی طرح اس کے اندر ابال سا آنے لگا "موت کے دکھ کو ایک دن بانٹے گا۔ کوئی دس دن لیکن دس دنوں کے بعد کون پوچھتا ہے۔۔۔۔ یہ شری کرشن کچھ بھی نہیں لگتا۔ صرف مرنے والے کا دوست' یہ ہی اب تک

ہمدردی کرتا چلا آ رہا ہے۔ ساتھ ہی ابلتے ہوئے پانی میں پڑی چھینٹ کی طرح خیال آیا---- لیکن کب تک----؟

دودھ کا گلاس اور چائے کی دو پیالیاں لے کر جب وہ کمرے میں آئی۔ کمرے کی فضا میں ایک ہلکی سی خوشبو تھی۔ جیسے بیتے ہوئے دنوں کی مہک ہو---- ان دنوں کی جب کنو کا باپ زندہ تھا---- آج پہلا دن تھا کنو جلدی سے دودھ کا گلاس پی کر کہنے لگی---- ماما آپ میرے ساتھ کبھی تاش نہیں کھیلتے۔ پاپ کھیلتے تھے۔ آج انکل کہتے تھے وہ میرے ساتھ تاش کھیلیں گے۔

ماں کو چھ ماہ سے تو کھانا پینا بھی بھولا ہوا تھا۔ ہاتھ میں پکڑی ہوئی چائے کی پیالی کے پہلے گھونٹ اسے یوں بھر دیا جیسے اسے ایک گرم گھونٹ کی بڑی ضرورت ہو۔

کنو کو صرف ایک ہی کھیل آتا تھا۔ تین پتی۔ جو وہ اپنے پاپا کے ساتھ کھیلتی تھی۔ کھیل میں کنو کی جیت ضروری ہوتی اور پاپا کی ہار۔ کنو کے نزدیک تاش کا کھیل صرف اس کے جیتنے کے لئے بنا تھا۔ وہ جب ہاتھ میں تاش کے پتے پکڑ کر پاپا کے پیچھے پیچھے دوڑتی ہوئی پاپا کو تاش کھیلنے کے لئے کہتی تو پاپا آگے آگے دوڑتے ہوئے جواب دیتے۔ نہیں بھئی' میں نہیں کھیلتا' میں ہار جاؤں گا۔

آخر کار کنو پاپا کو تاش کھیلنے کے لئے رضا مند کر کے یوں خوش ہوتی جیسے اس نے پاپا کو ہارے جانے کے لئے رضا مند کر لیا ہو۔

کنو انکل شری کرشن کے ساتھ تاش کھیلنے لگی پہلے تو دو باری اپنے پتے چھوٹے اور شری کرشن کے پتے بڑے دیکھ کر اتنی حیرانی ہوئی جیسے آج اس نے کوئی بہت ہی عجیب بات دیکھ لی ہو۔ اس کا معصوم سا چہرہ غصے سے روہانسا ہو گیا۔

شری کرشن یہ جان کر پتے دوبارہ تقسیم کرنے لگا۔ یکے' بادشاہ اور بیگمات کنو کی طرف اور چھوٹے پتے اپنی طرف----

کنو کا گم ہونا یقین دوبارہ واپس لوٹ آیا۔ وہ گھڑی پل میں وہی پرانے دنوں والی کنو ہوئی قریب بیٹھی ماں نے بھی جیسے یہ کنو آج چھ ماہ کے بعد دوبارہ دیکھی ہو۔

ماں کے اندر ایک حیرانی اور اطمینان سا ہوا۔ شری کرشن کو تو معلوم نہیں کہ کنو کے پاپا ہمیشہ بڑے پتے کنو کو دیتے تھے۔ پھر اس نے یہ کھیل کیسے بوجھ لیا----
"انکل ہار گئے----" کنو ہر باری اپنے پتے دکھاتے ہوئے جب زور سے ہنسی تو چھ ماہ سے اداس کھڑی گھر کی دیواریں بھی مسکرا دیں۔

اگلے دنوں میں کنو نے شری کرشن کے ساتھ جا کر کبھی سرکس دیکھا۔ کبھی آئس کریم کھائی کبھی نئے جوتے خریدے۔ جب ماں اسے اسکول داخل کروانے کے لئے لے کر چلی تو کنو نے ضد پکڑلی کہ وہ انکل شری کرشن کے ساتھ اسکول جائے گی۔

"اور پھر ایک حادثہ ہوا----"

گھر سے تھوڑی دور ایک سرکاری باغ تھا۔ جہاں ہمسایہ کی لڑکی کے ساتھ کھیلتے ہوئے کنو گر پڑی۔ اور اس کی ایک ٹانگ کی ہڈی چٹخ گئی۔ یہ ایک چھوٹا سا شہر تھا۔ جہاں جلدی میں صرف حکیم کو ہی بلایا جا سکتا تھا اس نے جب اپنے تجربے سے ہڈی چڑھائی تھی۔ تو اس کی مدد کے لئے صرف شری کرشن تھا۔ انہوں نے چیختی چلاتی کنو کی ٹانگ پکڑ رہی تھی۔ اس وقت کنو چیختی رہی "انکل میری ٹانگ چھوڑ دیں" لیکن جب اس کے کہنے پر شری کرشن نے ٹانگ نہ چھوڑی تو کنو کو جتنی بھی گالیاں آتی تھیں۔ وہ تمام کی تمام دے ڈالیں۔ وہ درد اور غصے سے رو رہی تھی اور گالیاں دے رہی تھی۔

ہڈی چڑھا کر پٹی باندھ دی گئی تھی۔ کنو جب سو کر اٹھی۔ اس کی ٹانگ میں درد نہیں تھا۔ یہ ایک دن کا واقعہ ہے کنو کو معلوم نہیں کیا ہوا اس نے شری کرشن کی گود میں بیٹھ کر آہستہ سے پوچھا "انکل اب آپ ہمارے پاپا ہیں نا؟"

شری کرشن نے آہستہ سے کنو کی پیشانی کو یوں چوما جیسے' جو بات اس سے نہیں ہو سکتی تھی وہ کنو نے کہہ دی تھی۔ اور پھر جیسے بات کا جواب لینے کے لئے اس نے کنو کی ماں کی طرف اس بات کو تقویت پہنچانے کے لئے دیکھا۔

ماں کنو کے سوال سے شاید بہت شرما گئی تھی' جھٹ سے کہنے لگی "یہ انکل

ہیں بیٹا---- تیرے پاپا تو وہ تھے' اس نے کنو کو دیوار سے لٹکتی تصویر کی طرف اشارہ کر کے بتایا۔ کنو نے اس طرف دیکھا پھر بھی شری کرشن کے کندھے سے چمٹتے ہوئے کہنے لگی "یہ بھی پاپا ہیں" تو شری کرشن نے کنو کو گلے سے بھینچ لیا۔

معلوا ہوا جنگ میں مرتے آفیسروں کی بیویوں کو سرکار مدد دے رہی ہے زمین بھی اور زمین پر گھر بنانے کے لئے روپیہ بھی۔ کنو کی ماں شہر اس لئے گئی تھی کہ اس نے کچھ سرکاری فارم بھرنے تھے۔ واپس آئی تو وہ اکیلی نہیں تھی۔ اس کے ساتھ کنو کے پاپا کے عہدے کے برابر کا کوئی آفیسر بھی تھا۔ جو سرکاری کاغذات کی جانچ پڑتال میں اس کی مدد کرنے اس کے ساتھ آیا تھا۔

شری کرشن مسلسل آتا رہا اور کنو کے ساتھ کھیلتا رہا۔ لیکن چند دنوں کے بعد ایک دن اچانک اس نے کنو سے کہا ہم یہاں نہیں باغ میں چل کر تاش کھیلیں گے۔ باغ میں جا کر وہ اسی طرح پتے بانٹتا رہا۔ کنو جیتتی اور ہنستی رہی۔ لیکن شری کرشن شاید پہلے کی طرح اس کی ہنسی میں شامل نہیں تھا۔ کنو اچانک تاش کو چھوڑ کر کہنے لگی۔ انکل آپ ہنستے کیوں نہیں آپ ہار جاتے ہیں نا اس لئے؟

شری کرشن کو محسوس ہوا جیسے کنو کے سوال پر اس کی آنکھیں بھیگ گئی ہیں شاید کچھ اندر سے پگھل کر آنکھوں میں آگیا تھا۔ اس نے کنو کو زور سے گلے سے لگا کر کہا۔ کنو بیٹا شاید ہم دونوں شکست کھا بیٹھے ہیں----

یہ خبر شہر کے ایک کونے سے نکل کر چاروں اور پھیل گئی کہ کنو کی ماں نے فوجی آفیسر سے شادی کر لی ہے۔ لیکن کچہری نے اس خبر کی تصدیق کئی دنوں کے بعد کی۔ لیکن شری کرشن کے دل نے کئی دن پہلے سے ہی یہ گواہی دے دی تھی۔ تصدیق شدہ خبر کے بعد شری کرشن نے اپنا ماتھا اپنی آنکھوں کے آگے جھکا لیا۔

کئی دنوں کے بعد وہ ایک بار گہری شام کے وقت اس بازار سے گزر رہا تھا۔ جو کنو کے گھر کے نزدیک پڑتا تھا۔ اس نے کنو کو اکیلی بازار میں گھومتے ہوئے دیکھا وہ رہ نہ سکا۔ نزدیک پہنچ کر کنو کو گود میں اٹھا لیا اور پوچھا' تو اس وقت سردی میں یہاں کیا کر رہی ہو؟

کنو کے ہاتھ میں ایک روپے کا نوٹ تھا۔ وہ اسے دکھاتے ہوئے کہنے لگی وہ جو پاپا ہیں نا' انہوں نے کہا ہے یہ پیسے لو اور باہر جا کر کھیلو۔۔۔۔ بازار سے ٹافی خرید لینا۔

شری کرشن نے ایک دوکان سے چاکلیٹ خرید کر کنو کو پکڑا دیا پھر اسے گھر کے دروازے تک چھوڑنے آیا۔ کنو کو یہ معلوم نہیں تھا کہ شری کرشن کتنی دیر تک باہر سڑک پر اندھیرے میں کھڑا رہا۔ اور کنو کو کہتا رہا تھا۔۔۔۔ میں نے تجھے کہا تھا نا۔۔۔۔ کنو۔۔۔۔ ہم دونوں ہی ہار گئے ہیں۔۔۔۔

پھر اس کے بعد کسی کی آواز کسی تک نہ پہنچی۔

شری کرشن کو بھی معلوم نہیں تھا کہ کنو نے ایک دن بخار کی مدہوشی میں ایک ہی بات کی رٹ لگا رکھی تھی۔

"پاپا کہاں ہیں؟"

ماں نے جب اشارہ کر کے کہا۔ دیکھو یہ تمہارے پاپا ہیں۔۔" تب کنو نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا "یہ نہیں وہ دوسرا۔۔۔۔"

❀❀❀

اجنبی اندھیرا

ایک اندھیرا تھا۔ جسے وہ جب سے پیدا ہوئی تھی پہچانتی تھی۔
پیدا ہوئی تھی تو کسی کی آواز کانوں کو سنائی دی شاید دادی اماں کی تھی۔
"چھوٹی آ گئی۔"

اس سے پہلے گھر میں ایک اور بیٹی تھی۔ اس درجے کے مطابق یہ پیدائشی لحاظ سے ہی چھوٹی پیدا ہوئی تھی۔ پھر سال سوا سال تک چھوٹی رہی۔ گھر میں ایک اور بیٹی نے جنم لیا۔تو یہ درجے کے مطابق "درمیانی" ہو گئی۔

نہ ماں زندہ رہی نہ نئی بیٹی پیدا ہوئی ---- درمیانی ایک اندھیرے میں کسی طرح کھڑی رہی۔ اور وہ اندھیرے سے مانوس ہو گئی۔ اس کا کسی نے کوئی نام نہیں رکھا۔ اسی طرح پکارا گیا "درمیانی ----"

پھر وقت کے ساتھ بڑی اس دیس چلی گئی۔ جسے پیا کا دیس کہا جاتا ہے اور باپ اس دیس سدھار گئے جہاں جا کر کوئی واپس نہیں آتا۔ اور پھر گھر میں آنے جانے والا جس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ اس کے باپ کا دوست ہے اس نے اسے اندھیرے میں ایک راہ دکھائی۔ جہاں قدم قدم چلتی وہ آخر اپنی روٹی کمانے والے سہارے تک پہنچ گئی۔

بڑی کھاتے پیتے گھرانے میں بیاہی گئی۔ درمیانی کو بھی وہ بہو، بیٹیوں کی طرح اپنے گھر کی چھت تلے رکھ سکتی تھی لیکن اسے بے کار سی جو اپنی آنکھوں کے سامنے بیتی جوانی کو دیکھنے والی بات تھی۔ اس لئے وہ درمیانی کا سہارا نہ بنی۔ اس لئے درمیانی نے بے آسرا ہونے کا سچ بھی اندھیرے کی طرح برداشت کر لیا۔

روزی کا سہارا ایک گاؤں کے چھوٹے سے اسکول کی نوکری تھی۔ اس سہارے کی مدہم لو میں اس نے پہلی بار اپنا نام تلاش کیا اس کے ہاتھ میں جو نام آیا "وچنی" تھا جسے اس نے درمیانی لفظ بدل کر اپنے نام کے ساتھ جوڑ لیا۔ لیکن یہ نام آج بھی اس کی یادداشت کے لئے اجنبی تھا۔ کئی بار اسے یاد نہیں پڑتا تھا۔

اس اندھیرے میں ایک حادثہ رونما ہوا۔ اس کے باپ کے دوست اور اس کے تعلقات کی کہانی اسکول میں ہر زبان پر تھی۔ جس کے نتیجے میں اس آدمی نے اپنی نوکری بچانے کے لئے وچنی سے کہا کہ وہ اسکول سے نوکری چھوڑ دے۔ یہ سچ ہے۔ یہ سہارا چھوڑتے وقت وچنی کے ہاتھ کانپ گئے---- لیکن اس آدمی نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ اس سہارے کی جگہ پر وچنی نے اس کا ہاتھ تھامتے اندھیرے کا بوجھ بھی اٹھا لیا۔

ایک اندھیرا تھا۔ جسے وہ جب سے پیدا ہوئی تھی پہچانتی تھی۔ اپنا گاؤں چھوڑ کر اس نے ایک بڑے شہر کی راہ لی۔ اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر قدم رکھتے ہی دیکھا۔ سامنے شہر کی جگمگاتی روشنیوں کے ساتھ ایک نیا اجنبی اندھیرا ہے جو پہلے مانوس اندھیرے سے بالکل الگ تھا۔ اس نے گھبرا کر اپنے دائیں طرف ٹٹولتے ہوئے اپنے باپ کے دوست کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا۔ جو اسے ایک اجنبی شہر میں لے آیا تھا۔ کہہ رہا تھا "بڑے شہروں کی بڑی باتیں ہوتی ہیں۔ یہاں گاؤں کی طرح کوئی کسی کی طرف انگلی نہیں اٹھاتا۔ تجھے پہلی سے بہتر نوکری مل جائے گی۔ میں ہفتہ وار چھٹی کے وقت تیرے ساتھ رہوں گا۔ بس گنتی کے برس رہتے ہیں جو گزر جائیں گے۔ جب میں پنشن پا لوں گا تو تیرے پاس آکر گھر میں رہوں گا۔

اس سہارے میں معلوم نہیں احسان مندی تھی کہ محبت۔ وچنی پر کچھ بھی واضح نہ ہو سکا۔ لیکن یہ ایک سہارا ضرور تھا۔ وچنی نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اور شہر کے اجنبی اندھیرے کو دیکھنے لگی۔ جس میں شہر کی ساری جگمگاتی روشنیاں ڈوبی ہوئی تھیں۔

تقریباً چھ ماہ بیت گئے۔ اسے محسوس ہوا یہ اجنبی اندھیرا اس کے لئے اب

بھی اجنبی ہے اس نے چھوٹے سرکاری ملازموں کی بستی میں ایک کمرہ کرائے پر لے لیا۔ تمام دن سند کو' ہاتھ میں پکڑے کئی اسکولوں کے راستے ناپے۔ پہلی تنخواہوں سے بچائے ہوئے پیسے روز اس کے پلو سے گر کر پلو کو خالی کر رہے تھے۔ اور اندھیرا اسی طرح اسے اجنبی دکھائی دے رہا تھا۔

اس اندھیرے میں مانوسیت کے لئے وہ ٹائپ سیکھنے لگی۔ معلوم ہوا کہ اس طرح شائد کوئی تدبیر ہو جائے۔ ویسے تو اس کے ساتھ ٹائپ سیکھنے والی کئی لڑکیاں بتاتی تھیں کہ شہروں میں سب سے بڑی ڈگری سفارش ہوتی ہے اور وہ گھبرا کر اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھنا شروع کر دیتی۔ جن کے پاس یہ سند نہیں تھی۔

اس کے ہاتھ میں صرف ہنر تھا۔ لیکن نوکری کے لئے جو چاہئے تھا۔ وہ اس کے ہنر میں نہ تھا۔ اچانک ایک دن کسی نے آکر اسے ڈھونڈ نکالا---- ڈھونڈنے والا ایک مل کا مالک تھا۔ جس نے اس کی طرف دیکھتے ہی اسے اپنے دفتر کے ایک کونے میں پڑی میز اور ایک کرسی دے دی تھی۔ اور ماہوار تنخواہ بھی مقرر ہو گئی۔

اس کے اپنے چھوٹے سے آئینے نے اسے کبھی نہیں بتایا تھا کہ وہ ایک اٹے ہوئے موتی کی طرح حسین ہے اگر اسے دھو اور پونچھ کر کالی مخمل پر رکھ دیا جائے تو دیکھنے والے کی آنکھیں چندھیا جائیں لیکن یہ بات مل کے مالک کو شاید اس کی ایک ہی نظر نے بتا دی تھی۔

اس کے باپ کا دوست ہر ہفتے نہیں تو دوسرے ہفتے ضرور اسے ملنے آتا۔ وہ وچنی کے بدن سے واقف ہوتے ہوئے بھی کوئی رشتہ نہیں جوڑ سکا۔ لیکن ہمسایہ میں اور مل مالک کی نظروں میں اس نے وچنی کے چچا ہونے کا رشتہ جوڑ لیا تھا۔

"ٹھیک ہے---- وچنی سوچتی۔" ایک عورت کا اور ایک مرد کا ایک ہی کمرے میں رہنا اور سونا۔ لوگوں کے لئے صرف کئے چنے رشتوں کی شکل میں ہی سمجھ آ سکتا ہے۔ اسے فکر تھی تو صرف مستقبل۔ جب وہ اپنی پہلی بیوی اور ملازمت کی مدت سے فارغ ہو کر وہاں آجائے گا اور میرے ساتھ گھر بسائے گا۔ تو پھر جن کے سامنے وہ اسے چچا کہتی ہے۔" پھر کیا کہے گی۔ لیکن وہ اس فکر کو اپنی

ہتھیلی سے پونچھ ڈالتی، پھر ہمسائے بدل لوں گی۔ اور کیا معلوم اس وقت تک ملازمت بھی تبدیل ہو جائے، یہ کون سی مستقل ملازمت ہے۔

کچھ مستقل ہونے کے نام سے اگر وہ آج تک کسی چیز سے واقف تھی تو وہ اس کے باپ کا دوست کا سہارا تھا۔ جو اس اندھیرے کا ایک حصہ تھا۔ جسے وہ جب سے پیدا ہوئی تھی پہچانتی تھی۔ اس کے لئے شہر کا اندھیرا ابھی تک اجنبی تھا۔ اور اس لئے مل مالک بھی جس نے اسے اس شہر میں پہلا روزگار مہیا کیا تھا۔ اس کی بہت مہربانیاں بھی اجنبی تھیں۔ جس میں ایک مہربانی یہ بھی تھی کہ اس نے پانچ نئی ساڑھیاں ایک گرم کوٹ اور کشمیر کی دو گرم شالیں اسے خرید کر دی تھیں۔ اور یہ سارا خرچ جو اس نے یہ کہہ کر کیا تھا کہ وہ اس کی تنخواہ میں سے آہستہ آہستہ وصول کرے گا۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا تھا۔ کسی مہینے بھی اس کی تنخواہ نہیں کاٹی گئی۔ یہ سب وچنی کے لئے اجنبی اندھیرا تھا۔ جو ابھی چھپنے میں نہیں آ رہا تھا۔ بلکہ کبھی کبھی اسے محسوس ہوتا کہ یہ اندھیرا اور بڑھ رہا ہے اس میں اس کا اپنا ہی نہیں برسوں کا پہچانا چہرہ بھی تھا۔ وہ اپنے بالوں کو باندھ کر چٹیا کیا کرتی تھی۔ لیکن مل مالک نے جب اسے ایک ہیر ڈریسر کا پتہ دے کر اس کے پاس بھیجا تو واپسی پر اس کا اپنا چہرہ بھی اسے اجنبی سا محسوس ہوا۔ دفتر میں سارے ملازم اسے دیکھ کر آنکھیں جھپکتے رہ گئے۔ سچ مچ کسی نے ایک موتی کو دھو پونچھ کر کالی مخمل پر سجا دیا ہو۔

ایک دن تقدیر کی طرح ایک اور حادثہ ہو گیا۔ وہ ٹائپسٹ کے ساتھ سیکرٹری بھی ہو گئی اس لئے مل مالک کی تمام ڈاک اسے ہی کھولنی پڑتی تھی۔ مل مالک کے نام کا خط کھولا۔ جس میں اس سے پہلی طلب پر بھیجے ایک ہزار روپے کا شکریہ تھا اور مزید پانچ سو کا مطالبہ۔ وچنی کے ماتھے میں ایک ٹھیس سی اٹھی جو اس کے پاؤں تک پھیل گئی خط کا لفظ لفظ کاغذ پر ساکت تھا۔ لیکن اس کی آنکھوں میں لفظ لفظ تھرک رہا تھا۔ اسے محسوس ہوا۔ پرانے مانوس اندھیرے میں سے ایک پرچھائیں نکل کر اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی ہے۔

مل مالک کے سامنے اس کا ایک سوال کانپا۔ آپ نے ایک ہزار روپیہ انہیں بھیجا اور مجھے بتایا نہیں----

چھوٹے سے جواب میں اس نے کہا۔ تجھے نہیں بتایا۔

لیکن اس چھوٹے سے جواب میں کچھ تھا۔ جو نکل کر وچنی کی عمر کے دور برسوں تک پھیل گیا۔

"اس نے مل مالک سے صرف ایک منت کی کہ وہ آئندہ کبھی اس سے چوری کسی کو کچھ نہیں بھیجے گا۔"

"ٹھیک ہے!" تمہارے لئے دیئے تھے۔ اگر تو نہیں چاہتی تو نہیں دوں گا---- مل مالک نے وعدہ کیا۔ لیکن وچنی اس سادہ سے جملے میں صرف دو لفظوں "تیرے لئے" سے گھبرا کر رہ گئی۔ جیسے اسے کوئی مانوس اندھیرے میں سے نکال کر آہستہ آہستہ اجنبی اندھیرے کی طرف جا رہا ہے۔

اس کے باپ کا دوست، اس ہفتے اور اس کے ساتھ کسی گرو یا پیر کے جنم کی چھٹی پر دو دن کے لئے اس کے پاس رہتا تھا جب وہ آتا۔ کمرے کی ایک چابی وہ اپنے ساتھ لے جاتا تھا۔ وہ دوپہر کی گاڑی سے آتا تھا اور آکر خود ہی کمرہ کھول لیتا تھا۔ اب کے بھی اس نے ایسا ہی کیا۔ وچنی چھ بجے شام واپس لوٹی تو وہ کمرے میں بیٹھا تھا۔ پہلی بار وچنی کو محسوس ہوا۔ آج اس نے اپنا نہیں غلطی سے کسی اور کا کمرہ کھول لیا ہے۔

"پاؤں دہلیز پر اٹک گئے۔"

مجھے معلوم تھا تم آنے والی ہو۔ دیکھو میں نے تمہارے لئے چائے بنا رکھی ہے۔ کمرے میں سے اس کی پہچانی ہوئی آواز آئی۔ پہچانے ہوئے اندھیرے کا ایک حصہ۔ وچنی کمرے میں داخل ہو کر چائے کی پیالی اس کے ہاتھوں سے پکڑ کر چائے بھی صبر کے گھونٹ کی طرح پینے لگی۔

چند لمحوں کے بعد اس کے ہاتھوں نے جو وچنی کی ساڑھی کے پلو کو کھینچتے ہوئے اس کے اعضا کو چھوہنا چاہتے تھے جسے مانوس ہاتھ چھوتے ہیں۔ لیکن یہ لمحہ

چاقو کی تیکھی دھار ایسا ہو گیا تھا جس نے گزرتے ہوئے لمحے کو وچنی سے کاٹ کر معلوم نہیں کہاں دور پھینک دیا- اور وچنی دیوار کا ایک حصہ ہو کر کمرے کی دیوار کے ساتھ کھڑی ہو گئی-

"مجھے بیچنے کے بعد بھی مرا بدن چاہتے ہو؟" وہ دیوار کی ایک اینٹ کی طرح کمرے میں بجی ہوئی تھی- اور پھر دیوار ساکت ہو گئی-

اس نے ایک تیکھی نظر سے دیکھا' پھر کہا "اگر میں یہاں کسی ہمسایہ کو بلا لوں اور بتاؤں میں تیرا کون ہوں تو یہاں کسی محلے میں بھی نہیں رہ سکے گی- یہ لفظ ایک ہتھوڑا تھا- کہنے والے کو محسوس ہوا کہ اب ساری دیوار گر پڑے گی- لیکن وچنی اینٹوں کی دیوار سے پتھر کی دیوار ہو گئی تھی- کہا "پہلے تم سے نپٹ لوں' گلی' ہمسایوں کے بارے میں بھی سوچ لوں گی-"

اس نے اٹھ کر وچنی کے ہاتھ کو زور سے بل ڈالا- اور پھر اپنا لوہے کے جیسا ہاتھ اس کی گردن میں جکڑ دیا' یہاں کون ہے تیرا' جو تجھے چھڑانے کے لئے آئے گا؟"

وچنی کو محسوس ہوا اس کی تو اپنی چیخ بھی اس کے اپنے کانوں سے ٹکرا رہی ہوے لیکن پھر بھی اس کی چیخ نے دروازے سے بھی سر پھوڑا تھا- چند لمحوں کے بعد ساتھ کے کمرے والے اس کا دروازہ کھٹکھٹا رہے تھے- ہاتھ ڈھیلا ہوا تو وہ اپنے آپ کو چھڑا کر دروازے کے پاس پہنچی اور پھر دروازہ کھول کر کمرے میں سے باہر نکل گئی-

یہاں میرا کون ہے----- دروازے کے باہر سچ مچ اجنبی اندھیرا تھا- وچنی ٹھٹھک کر کھڑی ہو گئی- لیکن اس کے پاؤں کے پاس شاید اس سے بھی کچھ پوچھنے کی مہلت نہ تھی- وہ آگے بڑھ گئے گلی کے موڑ والے گھر کی طرف جس گھر میں ٹیلی فون تھا-

اس گھر سے وچنی نے ایک ٹیلی فون کرنے کی اجازت چاہی نمبر ڈائل کرتے وچنی کے ہاتھ کانپ رہے تھے- یہ بھی اجنبی اندھیرا تھا- جس سے ڈر کر میں نے

ایک دن اس کا ہاتھ پکڑا تھا- اور آج اس کے ہاتھ سے چھوٹنے کے لئے میں اجنبی اندھیرے سے ایک اور ہاتھ مانگ رہی ہوں- وچنی کو محسوس ہوا جیسے اجنبی اندھیرا آج زور سے ہنس رہا ہے وچنی کے کان لرز رہے تھے- لیکن ٹیلی فون کے نمبر نہیں لرزے- دوسری جانب مل مالک کی آواز پوچھ رہی تھی- کون وچنی---- تم گھبرائی ہوئی ہو---- کس لئے؟ اس سے؟ اور آواز نے کہا- میں ابھی آ رہا ہوں----

چند لمحوں کے بعد وہ پہنچ گیا- ایک اجنبی اندھیرے کا ہاتھ---- اور اس نے وچنی کو اس سے چھڑا لیا- اس کے مانوس اندھیرے سے لیکن اس رات جب وچنی کمرے میں اکیلی بیٹھی تھی اسے محسوس ہوا اب آ گئے؟---- آ گئے----

اس اجنبی اندھیرے کے ہاتھ سے چھوٹنے کے لئے کسے آواز دے گی-

اور اس کا اپنا ہاتھ اس کی بھری ہوئی آنکھوں کے سامنے پھیل گیا- معلوم نہیں مجھے اپنے ہاتھ کا سہارا کب ملے گا---- کب؟---- کب؟----؟

اور دیا جلتا رہا

کوٹھری میں صرف آج کا اندھیرا تھا' جو سورج کے ڈوبنے کے بعد ویراں والی کی چارپائی کی ادھوائن پر گچھا ہوئے بیٹھے دیپے کی طرح کوٹھری میں پڑا تھا۔ لیکن دیپو کو یوں محسوس ہوا جیسے یہ کئی دنوں یک سیاہی ہو کم از کم بیس دنوں کی۔ جس دن اس نے اپنے مرے ہوئے بچے کو اول سمیت باہر ایک گھڑے میں دبا دیا تھا۔ اُسے یوں لگا اس کے بدن کا بھی اور ویراں کے بدن کا بھی ایک ٹکڑا بکھر کر ہمیشہ کے لئے کسی اندھی کھائی میں ڈوب گیا ہے۔

زچگی کا درد تو زچہ کو مارتا ہی ہے' دیپو کو خیال آیا لیکن ویراں والی کو جس آہ نے مار ڈالا ہے اس کا کیا علاج......؟ گاڑھے کا ایک گھونٹ پی کر اوندھے منہ لیٹی ویراں والی کے بدن پر ہاتھ پھیرتے ہوئے دیپے نے ایک گہرا سانس لیا۔

اندھیرے میں ایک کھٹکا ہوا اور طاقچے میں رکھے ہوئے دیئے کی لو تھرتھرائی۔ دیپے نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ دیواز کے قریب بھاگی ہاتھ میں ماچس کی ڈبیہ لئے کھڑی تھی۔

"اٹھ اور گڑ کی بھیلی نکال دے' میں تجھے چائے کا گھونٹ بنا دوں" بھاگی کی آواز دیئے کے لو کی طرح کانپی تو دیپے کی آواز بھی تھرکی' نہیں ابھی دیرو کے لئے گاڑھا بنایا تھا تو میں نے بھی ایک گھونٹ بھر لیا تھا۔

بھاگی دروازے کی طرف مڑتی ہوئی دہلیز کے پاس اٹک گئی' کالے دوپٹے میں لپٹا اس کا گورا چٹا چہرہ ایک لمحے کے لئے دیپے کی آنکھوں میں چمک اٹھا اور پھر اچانک اس روشنی میں اسے یوں محسوس ہوا جیسے بھاگی ابھی دہلیز پر سے باہر چلی گئی

ہو اور اس کی جگہ جمنا آ کھڑی ہوئی ہو۔

یہی دہلیز تھی جس پر ایک دن جمنا آ کر کھڑی ہوئی تھی- یونہی ہاتھ میں ماچس کی ڈبیہ پکڑے اس نے طاقچے میں رکھے دیئے کو جلایا تھا- اس وقت چارپائی کی ادھوائن پر دیپا نہیں اس کا باپ بیٹھا ہوا تھا۔

باپ نے کہا' دیپا تیرے جنم لیتے ہی تیری ماں مر گئی تھی- تب روٹی کو دودھ میں بھگو کر جس نے تجھے زندگی دی تھی وہ جمنا ہی تھی- وہ ہر روز آ کر دیا جلاتی تھی یوں بھی جمنا دیپے کو یاد آ گئی- کمر میں سبز اور کبھی پیلا تہبند گلے میں تریزوں والا کرتا' سر پر ململ کا سیاہ پلو گلے میں چاندی کی زنجیر اور کانوں میں چاندی کی بالیاں۔

"جب وہ روٹی کو چھوڑ کر کٹوری کے ہاتھ دودھ پینے کے قابل ہوا تھا تو باپ بتاتا تھا کہ وہ جمنا کی بالیوں کو مٹھی میں لینے کے لئے ہاتھوں میں پکڑا جھنجھنا بھی پھینک دیتا تھا- اور جو اس کے باپ نے اسے نہیں بتایا تھا- وہ جوان ہونے پر لوگوں نے بتا دیا-"

"دیپے کوئی روپ تھا جمنا کا' لیکن جمنا بھری بھری چلی گئی- کسی نے اس کے جل کو نہیں پیا- تیرے باپ نے مراثیوں کے برسوں دروازے اکھاڑ دیئے تھے- گل میں راگ بھر کر جب وہ آواز دیتا "جمنا جل بھرنے دو" تو گاؤں کی دیواریں بھی کانپ اٹھتیں......"

سارا گاؤں جانتا تھا اور دیپا بھی کہ جمنا تیسری جگہ جس بوڑھے کے پلے پڑی تھی وہ صرف چار پھیروں کی چور تھی اور بوڑھے کے مرنے کے بعد ہمیشہ کے لئے میکے آ گئی۔

یہ تو دیپے کی آنکھوں دیکھی تھی کہ جب اس کا باپ گڑ سونف او سنترے کے چھلکے ڈال کر ببول کی چھال کی شراب نکال کر پیتا تو مدھوش ہو کر گاتا۔

تیرے ساہنواں دی سونف نوں سنگھ لئے
گڑ واتیئے مٹھے کاتیئے نی
تینوں ہک دے اندر اتار لئے
اگ رنگیئے سوہیے چواتیئے نی

جمنا کا سانولا رنگ کالے پلو میں جگمگا اٹھتا' جو دیپو کی آنکھوں کے آگے پہنچنے اون کا ایک سیاہ دوشالا پھیلا دیتا۔

ستر بہتر برس کی زندگی لٹھ کے سہارے کمر جھکائے وہ گاؤں کی سربتی بھجھی تھی چار دنوں کی تو بات تھی جب آتے جاتے دیپو کی پیٹھ پر پیار دیتی تو دیپا کہتا "پھپھی تمہارے پاؤں چھوتا ہوں۔" تو وہ کہتی "ارے تمہاری پھپھی میں کس رشتے ہوئی' لوک پھٹے ہوؤں کو گانٹھ لیتے ہیں۔ لیکن رشتے تو صرف خدا گانٹھتا ہے اور کسی کے بس میں نہیں۔

دیپو کو اپنی دادی یاد آئی جو جیونی کو ہمیشہ مرنی کہا کرتی تھی۔ اس کے مرنے کے بعد گاؤں کی زلیخا نائن نے بتایا کہ دیپے کی دادی نے ہی گھر کی چھت کو سر پر تھام رکھا تھا۔ نہیں تو اس گھر کی بنیادیں تو جیونی نے ایک نظر سے ہلا کر رکھ دی تھیں۔

زلیخا نائن نے جیونی کے جیتے جی اسے ایک لوک کتھا بنا دیا تھا۔ ایک بار تو جیونی نے تمام رات دادا کو اپنی رضائی میں چھپائے رکھا۔ مزارعوں نے گاؤں کے کنویں' جوہڑ تالاب سبھی چھان مارے لیکن جیونی کی رضائی کون ٹٹولتا' صبح صادق ہوئی تو وہ کیا کر سکتی تھی۔ اس نے اپنی آنکھوں کے سامنے اسے گھر کی دیوار سے پھلانگ دیا۔ اور یہ بھی زلیخا نائن کے بتانے پر سارا گاؤں جانتا تھا۔ دیپ کی دادی شاہو کارن تھی۔ اس نے اپنے ناخنوں سے جیونی کی رضائی کو پھاڑ ڈالا جیسے کسی کا پیٹ پھاڑا جاتا ہے۔

دیپے کو اون کے سیاہ دوشالے میں لپٹی ہوئی ہڈیوں کی مٹھ جیونی یاد آئی اور ساتھ ہی دادا کی بیراگی ہوک سنائی دی۔ وہ کنویں کی منڈھیل پر بیٹھ کر گاتا تھا۔

دل لگ گیا بے پرواہ دے نال
پار جھناں دے ماہی دا تھانہ
کیتے قول ضروری جانا
ان بن ہو گئی ملاح دے نال

دیپ کو ایک چکر سا آ گیا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے کالے دوپٹے اس طرح پھیل گئے جیسے گہرے دریا میں کئی کشتیاں بغیر چپو کے کھڑی ہوں' وہ نہ تو ڈوب رہی ہوں' اور نہ تیر رہی ہوں' اور نہ ہی کسی کنارے پر آ لگی ہوں۔

کوٹھری کے کھلے دروازے میں سے ہوا کا جھونکا آیا۔ دیپے نے گلے میں پڑے اونی کرتے کا بٹن لگایا اور ہاتھ لمبا کر کے ویراں والی کے اوپر کھیس دوہرا کر دیا......

چارپائی پر ویراں والی یوں ہی تو پڑی تھی' کوٹھری کے طاقچے میں دیا اسی طرح ٹمٹما رہا تھا' اور دیپا چارپائی کی ادھوائن پر کسی مخمصے میں بیٹھا تھا' بھاگئے تیری خاطر میں وارث کے اشعار ڈھونڈ ڈھونڈ کر گاتا تھا۔

وارث شاہ نوں مار نہ بھاگ بھریئے
آنی منس دیئے پیاریئے واسطہ ای

لیکن تو نے تو میرا کوئی واسطہ نہیں مانا...... جیسے جیونی میرے دادے کی مڑھی (قبر) پر دیا جلانے کے لئے چل پڑی ہو اور جیسے جمنا آج بھی دیا سلائی کی ڈبیہ لے کر دیا جلانے آ گئی ہو۔

طاقچے میں جلتے دیئے کو جب دیپے نے اٹھ کر پھونک سے بجھانا چاہا تو اس کی چلتی سانس اس کے گلے میں رک گئی اور دیا جلتا رہا......

❀❀❀

سات سو بیس قدم

اندھیرا قدم قدم گہرا ہو رہا تھا۔
اس کے گلے میں نیلے رنگ کی قمیص تھی۔ جو سیلٹی رنگ کی تپلون کی طرح اندھیرے رنگ کی ہو کر اب اندھیرے کا ایک حصہ بن گئی تھی۔ لیکن اس کے پاؤں میں سفید کینوس کے بوٹ تھے۔ جن کا ایک الگ وجود تھا۔
وہ برابر انہیں تکے جا رہا تھا' یوں جیسے وہ خود ایک ایسی جگہ پر کھڑا ہو اور اس کے پاؤں برابر چل رہے ہوں۔ اسے محسوس ہوا' وہ پاؤں کو صرف دیکھ نہیں رہا تھا بلکہ ان کی ہر حرکت کو گن رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر اس وقت سات سو بیس کی گنتی تھی۔
پاؤں کے نیچے پختہ سڑک معلوم نہیں کب ختم ہوئی اور کچی سڑک کب شروع ہوئی شاید گھر سے نکلتے ہی اس نے ہر قدم کو گننا شروع کر دیا تھا' اور اس وقت اس کے ہونٹوں پر سات سو بیس کی گنتی تھی ——
گنتی ختم ہوئی کیونکہ راستہ رک گیا تھا۔ سامنے دائیں بائیں صرف درخت ہی تھے۔ اور پاؤں کے نیچے والی درختوں کے ساتھ ساتھ بل کھاتی پگڈنڈی بھی ختم ہو گئی تھی۔ جہاں درختوں کے جھنڈ تھے' وہاں ایک ٹوٹا ہوا کنواں تھا۔
شاید ہوا تیز چل رہی تھی۔ درختوں کے جھومتے پتے آپس میں ٹکرا رہے تھے۔ جیسے بے شمار مدھم مدھم سی آوازیں پتوں پر بیٹھی ہوں۔
"نہیں' جیسے' کتنی ہی آوازیں درختوں پر جاگ پڑی ہوں۔ چند پتے ٹوٹ کر اس کے پاؤں کے قریب آ کر گرے۔ اس کے پاؤں جیسے جلنے سے رہ گئے ہوں۔

پتے پاؤں میں گر کر بھی ہلتے رہے جیسے اس کے پاؤں میں سرگوشیاں کر رہے ہوں۔

اس کا---- اپنے پاؤں کی طرف جھکا ہوا سر اور نیچے جھکا۔ اور پاؤں کی طرف سے اٹھتی کتنی ہی آوازیں اس کے کانوں میں سے گزر کر اس کے ماتھے میں آ لگیں۔ ان آوازوں میں سے ایک آواز پرندے کے پروں کی طرح اس پر جھپٹ رہی تھی۔ پہلے گالیوں کی صورت میں اور پھر----

اس کے بدن کی ایک ایک ہڈی دکھنے لگی۔ جیسے ہر ہڈی نے یہ درد برسوں سے سنبھال رکھا تھا۔

کتنی دیر نیتا کے بھائی کی گالیاں جیسے آج بھی کہیں سے آ رہی تھیں۔ اس نے دونوں ہتھیلیوں سے اپنے کانوں کو ڈھانپ لیا' اور پھر سارا دھیان اکٹھا کر کے نیتا کی آواز سننے کوشش کرنے لگا۔

لیکن نیتا کی آواز اس کے ہونٹوں میں جکڑی ہوئی تھی ' اور ہونٹ کھلتے نہ تھے۔ نیتا اس سے کتنی باتیں کیا کرتی تھی' لیکن اس دن جب اس کے بھائی نے اس کی کتاب میں رکھا ہوا سنیل کا خط پڑھا---- اور سنیل کو بلا کر ایک کمرے میں بند کر کے اسے گالیاں دی تھیں لیکن نیتا کی آواز اس کے ہونٹوں میں بند تھی۔ اور پھر اس کے بھائی نے سنیل کو زخمی ہونے کی حد تک پیٹا تھا۔ نیتا کی آواز اس نے پھر کبھی نہیں سنی۔ وہ شاید ہمیشہ کے لئے اس کے ہونٹوں میں ڈوب گئی تھی۔

آج پھر اس نے سارا دھیان اکٹھا کر کے ایک بار نیتا کی آواز سننے کی کوشش کی۔ لیکن اس کی آواز کہیں نہیں تھی۔

3

سنیل کے ماتھے میں ڈھیروں آوازیں قہقہے لگا رہی تھیں۔

نہیں یہ آوازیں گدلے پانی کی طرح لوگوں کے کانوں کو پھاڑ کر ہونٹوں میں سے بہہ رہی تھیں۔ جس میں ان کی تھوکیں ملی ہوئی تھیں۔

آوازوں کا سیلاب سا ایک دن اس کی پیٹھ کی طرف آ رہا تھا۔ اور وہ پوری طاقت سے اس سے بچنے کے لئے دوڑ پڑا تھا۔

اس کا سانس گلے میں پھولتا اس کے گلے میں اٹک رہا تھا۔ اس کی آنکھیں اس کے چہرے پر پھیل کر جیسے پھٹنے پر آ گئی تھیں' اس کے ہاتھ میں ایک کاغذ تھا۔ جس کے لفظ ہتھیلی کے پسینے سے شاید پگھل گئے ہوں۔ اس نے پرنسپل کی آواز کالے رنگ کی گرم دھار کی طرح اپنے کانوں میں ڈھلتی محسوس کی۔۔۔۔ تجھے ہوسٹل سے نکالا جا چکا ہے۔ ہوسٹل کے سب کمروں میں جتنی بھی آوازیں بند تھیں وہ سب باہر سڑکوں پر بلکنے لگیں تھیں' وہ آگے ہی آگے دوڑ رہا تھا' اور آوازوں کا ایک بہاؤ اس کے پیچھے تھا۔

کتنے برس ہوئے جب وہ کالج میں پڑھتا تھا؟ شاید پانچ برس ہو گئے ہیں اور یہ آوازیں جب اس کے ماتھے میں پڑیں تھیں۔ اس وقت سے اس کے ماتھے میں کھڑی ہو گئیں تھیں۔ شاید تب سے اس کے ماتھے سے اتر کر نیچے اس کے پاؤں کے تلووں میں جا کر بیٹھ گئی تھیں۔ اسے یاد نہیں اس کے پاؤں کبھی ایک جگہ نہیں کھڑے ہوئے تھے۔ اور نہ ٹک کر بیٹھ سکتے تھے۔ نہ چارپائی پر آرام سے لیٹ سکتے تھے۔ وہ آدھی آدھی رات کو بھی کمرے میں چلتا رہتا تھا۔ ایک دیوار سے دوسری دیوار تک پھر دوسری دیوار سے تیسری دیوار تک۔ اور چوتھی دیوار کا دروازہ اس کی ماں رات کو روز باہر سے بند کر دیتی تھی۔

آج وہ سب پرانی آوازیں اس کے پاؤں سے پھر اوپر' اس کے ماتھے میں آ گئی تھیں۔ اس کے پاؤں جہاں کھڑے تھے' ساکت وہاں کھڑے رہے۔ اور اس کا ماتھا آوازوں کے زور سے کانپ رہا تھا۔ جیسے بہت سارے لوگ افراتفری میں کسی مکان کی چھت پر چڑھ جائیں اور چھت ان کے بوجھ سے ہلنے لگے۔

ایک شوکی تھا۔ اشوک' جو تھوڑی دیر اس کی بانہوں کا سہارا لے کر اس کے ساتھ چلا کرتا تھا' پھر معلوم نہیں کس وقت وہ بھی اس کی بانہوں سے پھسل کر کہیں چلا گیا۔

"نہیں، اسے یاد آیا۔ پرنسپل نے اپنے ہاتھوں سے شوکی کو پکڑ کر اس کی بانہوں سے الگ کیا تھا۔ اور اسے اکیلا کمرے کی تیز روشنی میں کھڑا کر کے پوچھا تھا، سچ سچ بتا، تو کتنے دنوں سے اشوک کو رات اپنے کمرے میں لے جایا کرتا تھا۔۔۔۔؟"

اسے یاد تھا۔ اس نے ایک رات۔۔۔۔ اشوک کو اپنے کمرے میں بلایا تھا۔ وہ کتنی دیر مل کر پڑھتے رہے پھر ایک ہی بستر پہ سو گئے تھے۔ اور اسے اس رات اس کا ملائم بدن بالکل نیتا کے بدن کی طرح لگا۔ اس نے اشوک کی سوئی ہوئی بانہوں کو کتنی دیر اپنے گلے میں ڈالے رکھا۔ پہلے اس نے اپنے ہاتھ اس کے کندھوں پر رکھے پھر پیٹھ پر۔۔۔۔ پھر نیچے کمر میں پھر نیچے ٹانگوں پر۔۔۔۔

ایک رات اور۔۔۔۔ پھر ایک رات اور۔۔۔۔ کتنی عجیب بات تھی کہ اشوک کی شکل بھی نیتا کی شکل میں تبدیل ہو گئی...... اس نے اس رات پہلی بار نیتا کے ہونٹ چومیں تھے۔ نہیں نیتا کے نہیں اشوک کے۔

اس وقت آدھی رات کو بھی آدھے کپڑے ہمیشہ اس کے تن پر ہوتے تھے۔ لیکن پرنسپل نے جب اسے کمرے کی تیز روشنی میں کھڑا کر کے اس سے رات والی بات پوچھی تھی، تو اسے پہلی بار محسوس ہوا۔ جیسے اس کے بدن پر سے کسی نے سب کپڑے اتار دیئے ہیں۔ اور وہ سردی اور شرم سے کانپنے لگا تھا۔ اس نے بولنے کی کوشش کی۔ لیکن اس کی آواز ہکلانے لگی۔ تب پانچ برس سے وہ ہکلا جاتا تھا۔

پرنسپل نے اس کے ہاتھ میں ایک کاغذ پکڑا کر اسے کمرے میں سے باہر بھیج دیا تھا۔ لیکن باہر اس کے ہوسٹل کے تمام لڑکے بند باندھے پانی کی طرح کھڑے تھے اور اسے دیکھتے ہی۔۔۔۔ اس کے پیچھے یہ پانی کے سیلاب کی طرح چل پڑے تھے۔

آوازیں اس کے سارے بدن پر برس رہی تھیں۔ لیکن اس کے ماتھے میں شدید درد ہو رہا تھا۔ اس کی رگیں جیسے اس کے ماتھے میں پھٹ رہی تھیں۔

اس دن۔۔۔۔ اور اس کے بعد کئی بار۔۔۔۔ وہ بیٹھا بیٹھا اپنے ماتھے کو ٹٹولنے لگ پڑتا تھا۔ اسے محسوس ہوتا تھا۔ جیسے اس کے ماتھے کی ایک رگ ٹوٹ کر

اس کے ماتھے میں سے باہر نکل آئی تھی---- اس کا باپ اسے شاید کسی ڈاکٹر کے پاس لے گیا تھا۔ اور ڈاکٹر نے اسے معلوم نہیں سرخ رنگ کی گولیاں کھلا کر کتنی دیر بے ہوش رکھا تھا اور پھر ایک بے ہوشی سی اسے ہمیشہ رہنے لگی۔

نہیں----:

سنیل کو ایک بھولے ہوئے خیال کی طرح یاد آیا کہ اس بے ہوشی میں بھی اسے ہوش دیتا ہے اس وقت جب تریزاں نے اسے کہا تھا کہ وہ سنیل کے ساتھ شادی کر لے گی۔ اگر سنیل کا باپ اپنا مکان سنیل کے نام کر دے۔

وہ بڑی دور تک تریزاں کی سوچ کو دیکھ رہا تھا۔ اور پھر اس نے کہا' اور اس کے بعد اس کے بعد تم کہو گی کہ وہ مکان میں تمہارے نام کر دوں!

تریزاں اس کی ہکلاتی آواز پہ دیر تک ہنستی رہی اور پھر کہنے لگی ہکلے بابو' میں تجھ سے بہتر مکان کو سنبھالوں گی اور اسے سجاؤں گی---- ہر برس اسے رنگ و روغن کراؤں گی۔ سنیل نے کہا تھا۔ تم دو کتے ہمیشہ پاس رکھتی ہو۔ میں تیرا کتا نہیں بن سکتا۔

5

لیکن ایک عجیب بات تھی' اسے یاد آیا کہ جس ڈاکٹر نے اسے سرخ گالیاں دے کر بے ہوش کیا تھا۔ اور جسے وہ روز کئی دن تک دیکھتا رہا تھا۔ ایک دن اچانک اس ڈاکٹر کا چہرہ کسی اور طرح کا چہرہ ہو گیا تھا۔ وہ کتنے دن حیران ڈاکٹر کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔ اور پھر تھوڑے دنوں کے بعد اس نے ڈاکٹر کے چہرے کا چوڑا چپٹا سا ناک اس لمبے ناک میں تبدیل ہو گیا تھا۔ اس نے اپنے باپ کی منت سماجت کی تھی کہ وہ اسے اس ڈاکٹر کے پاس نہ لے جائے۔ اس کے باپ نے ایسا ہی کیا۔ سنیل کو تذبذب میں دیکھ کر---- باپ نے کہا کہ وہ پہلا ڈاکٹر اور تھا دوسرا ڈاکٹر بھی کوئی اور تھا۔ اور اب یہ نیا ڈاکٹر کوئی اور ہے۔ لیکن اسے پورا یقین تھا کہ وہ ایک ہی ڈاکٹر تھا۔ جو کچھ دنوں کے بعد اپنی شکل تبدیل کر لیتا تھا۔ بالکل اسی طرح

جس طرح وہ سرخ رنگ کی گولیوں کو کبھی ہرے رنگ کی کر دیتا ہے کبھی پیلے رنگ کی۔

ایک دن اس نے خود سنا تھا کہ وہ ڈاکٹر اس کے باپ کو کہہ رہا تھا---- کہ وہ اسے بجلی کے جھٹکے لگائے گا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ اب ڈاکٹر اس کو بجلی کے کرنٹ لگا کر مار دینا چاہتا ہے---- وہ ڈاکٹر سے بھاگ کر سیدھا گھر اپنے کمرے میں مقید ہو گیا۔

ماں نے روٹی پکا کر دروازہ کھٹکھٹایا لیکن اسے معلوم تھا اگر اس نے دروازہ کھولا تو اس کا باپ اسے پکڑ کر سیدھا ڈاکٹر کے پاس لے جائے گا۔ اور ڈاکٹر اسے بجلی کا کرنٹ لگا کر مار دے گا۔ اسی لئے اس نے دروازہ نہیں کھولا۔ صرف سلاخوں والی کھڑکی میں سے ہاتھ ڈال کر ماں سے روٹی پکڑ لی تھی۔ دوسرے روز اس کی ماں کہتی رہی کہ وہ دروازہ کھول دے تاکہ گھر کے نوکر سے اس کے کمرے کی صفائی کرائی جائے لیکن اسے معلوم تھا یہ سب دروازہ کھلوانے کے بہانے ہیں۔

اور پھر---- پھر اس کے سگریٹ ختم ہو گئے جو اس کی ماں نے اسے منگوا کر نہیں دیئے تھے وہ کہتی تھی کہ وہ دروازہ کھولے گا تو سگریٹ ملیں گے۔ اس نے نوکر سے کہا کہ وہ اس کے لئے بازار سے سگریٹ لا دے۔ نوکر پیسے تو لے گیا۔ لیکن سگریٹ خرید کر نہیں لایا---- بے ایمان کمینہ!!!

اسے خیال آیا---- بس ایک بات اچھی تھی کہ اس کا غسل خانہ کمرے سے ملحق تھا۔ اور جس کا دروازہ کمرے میں تھا' نہیں تو اسے کمرے کا دروازہ کھولنا پڑتا' اور اس کے ماں باپ نے اسے پکڑ کر زبردستی ڈاکٹر کے پاس لے جاتے۔

اسے محسوس ہوا---- اس کا ذہن جیسے پانی کا ایک تالاب تھا۔ جس میں کتنی ہی آوازیں ڈبکیاں اور غوطے کھا رہی تھیں۔

کبھی کبھی کوئی آواز پانی سے تیرتی ہوئی باہر کنارے پر بھی آ جاتی۔

سنی بابو سے سنی بابو---- وہ بدک کر رہ جاتا ہے۔ یہ کاشنی کی آواز کہاں سے آ رہی ہے؟ کاشنی---- رامداس دھوبی کی بیٹی---- جب آتی تھی اسے سنی

بابو' کہہ کر بلاتی تھی- وہ اپنا نام ہمیشہ درست کر کے اسے بتاتا تھا سنی بابو نہیں' سنیل بابو---- لیکن کاشنی سے آخری لفظ کبھی ادا نہ ہو سکے وہ کہتی "---- تو کہہ رہی ہوں---- سنی بابو----"

اس دن کاشنی نے سلاخوں کی کھڑکی کے قریب کھڑی ہو کر اسے آہستہ سے آواز دی- سنی بابو اور اپنے دوپٹے میں سے سگریٹوں کی ڈبیہ نکال کر اسے پکڑا دی- اس کے پاس پیسے ختم ہو گئے تھے- اس نے اپنے کوٹ اور پتلون کی جیبوں کو اچھی طرح ٹٹولا صرف پچیس پیسے نکلے تھے- جو پوری ڈبیہ کے پیسے نہیں تھے- لیکن کاشنی نے وہ پچیس پیسے بھی نہ لئے- پھر دوسرے دن اس نے سگریٹوں کی ایک اور ڈبیہ لا کر اسے سلاخوں والی کھڑکی میں سے پکڑ دی-

وہ ہر صبح انتظار میں رہتا- کاشنی کب کپڑے استری کر کے لائے اور اس کی کھڑکی کے قریب آ کر اسے آواز دے- سنی بابو---- اسے اپنا نام سنیل کی بجائے سنی بابو اچھا لگنے لگا- ہاں---- اس نے کاشنی کے کہنے پر ایک دن کمرے کا دروازہ کھول دیا تھا---- اور وہ کمرے کو صاف کر کے اس کے میلے کپڑے لے کر چلی گئی-

دوسرے دن وہ اس کے کپڑے دھو کر لائی- اس نے غسل خانے میں جا کر جب کپڑے پہنے تو کاشنی نے غسل خانے کا دروازہ کھول کر کہا- "سنی بابو تم بہت سندر ہو-"

اس کے ذہن میں کاشنی کی بانہوں کی چوڑیاں چھنکنے لگیں---- وہ پاؤں میں چاندی کے گھنگھرو باندھتی تھی' اسے یاد آیا' کہ ایک دن کاشنی نے پاؤں میں مہندی لگائی ہوئی تھی- اسے محسوس ہوا کہ نرم نرم پاؤں کبوتروں کی طرح اس کے کمرے میں آ گئے ہیں- اس نے دونوں ہاتھوں میں جیسے دو کبوتروں کو پکڑ لیا ہو- کاشنی خاموش اس کی چارپائی پر بیٹھ گئی- اور اس دن کاشنی نے اس کے کانوں کے قریب اپنا چہرہ لا کر کہا تھا- سنی بابو تم بہت سندر ہو-

سنی بابو---- سنی بابو---- اس کا سارا ذہن اسی آواز سے بھر گیا تھا-

اس نے ہاتھ کی ہتھیلی سے اپنے ماتھے کو ٹٹولا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے آواز اس کے ماتھے میں سے لہو کے دھارے کی طرح اب باہر کہ بہنے لگی ہے۔

اس نے ہاتھ کی ہتھیلی کو دیکھا۔ لیکن اندھیرے میں اب دکھائی نہیں دے رہا تھا کہ اس کی ہتیھلی پر لہو تھا بھی یا نہیں!

ہاں' اسے یاد آیا' اس دن اس کے بستر کی چادر پر کتنا لہو تھا---- کاشی نے اس کے بستر سے اٹھ کر---- بستر کی چادر اٹھا لی تھی اور کہا تھا کہ وہ چادر کو کل دھو کر لا دے گی۔ وہ کاشنی کو پوچھتا رہا کہ اس کی چادر پر لہو کہاں سے آ گیا ہے۔ لیکن کاشنی ڈوپٹے کا پلو منہ میں دبا کر ہنستی رہی۔ اور چادر کو گچھا مچھا کر کے دھونے کی غرض سے اپنے ساتھ لے گئی۔ کاشنی پھر بھی آئی---- پھر بھی---- لیکن پھر وہ مر کیوں گئی؟

ماں نے بتایا۔ نوکر نے کہا اور برگد کی چھاؤں والے دوکاندار نے بھی کہ کاشنی کنویں میں ڈوب کر مر گئی تھی----

کاشنی کا بچہ----؟ درختوں میں چند جگنو چمک رہے تھے۔ سنیل کے ماتھے میں بھی کچھ جلنے بجھنے لگا' ؛اشنی کا بچہ میرا بچہ تھا؟---- کاشنی کا بچہ---- میرا بچہ؟؟---- اور وہ حیران تھا۔ اسے یہ خیال کبھی پہلے کیوں نہیں آیا۔

سنیل کو یاد آیا۔ آج صبح اس کے گھر کے سامنے کھلی پڑی جگہ پر کتنے بچے کھیل رہے تھے وہ کتنی دیر کھیلتے ہوئے بچوں کے پاس جا کر کھڑا رہا۔ ان میں ایک تین برس کی بچی تھی۔ سفید فراک والی' طلوع ہوتے سورج کی سنہری دھوپ میں وہ ایک پھول ایسی معلوم ہو رہی تھی۔

سنیل نے اسے پیار سے گود میں اٹھا لیا اس کے گال چومے اور ماتھا بھی---- اس کے ہاتھ---- اس کے پاؤں----

اور پھر کہیں سے ایک موٹی سی کالی عورت آ کر چیخیں مارنے لگی۔ شاید وہ اس کی آیا تھی۔ پھر کتنے لوگ اکٹھے ہو گئے تھے۔

گھبراہٹ سے اس کی باہیں کانپنے لگیں لیکن لوگوں نے اس کے گرداگرد

ایک گھیرا ڈال کر اس بچی کو اس سے چھین لیا تھا۔
اس کی ماں بھی آ کر رونے لگی وہ اسے بانہوں سے پکڑ کر کمرے کے اندر لے آئی۔ اس کے باپ نے کہا۔ کل وہ اسے پاگل خانے لے جائیں گے۔
یہ شاید---- سنیل نے اپنے خیالوں کو چیر کر دیکھا۔ شاید یہ میرے لاشعور میں پڑا ہوا میرے بچے کا خیال تھا۔ اگر کاشنی جیتی رہتی تو وہ بچہ ایسا ہی ہوتا۔ سفید فراک والی بچی ایسا---- کاشنی مر کیوں گئی؟

7

اوہ وہ کنواں----؟ سنیل کے پاؤں کے نیچے جو پگڈنڈی پرانے کھنڈر سے ہوتی ہوئی کنویں پر ختم ہو گئی تھی۔ سنیل کنویں کو دیکھنے لگا۔
لوگ کہتے تھے' سنیل کو یاد آیا کہ کاشنی نے بارہ دری والے پرانے ٹوٹے ہوئے کنویں میں چھلانگ لگائی تھی---- اور کیا؟ یہ وہی بارہ دری والا پرانا کنواں ہے یا کوئی اور......؟
سنیل نے چاروں اور دیکھا۔ وہاں صرف درخت تھے اور درختوں سے جھڑتے پتے۔ اور پھر اسے یاد آیا کہ بارہ دری تو اس کے گھر کی پچھلی جانب پختہ سڑک کے پار ہوتی ہے یہ شاید وہی سڑک تھی۔ اور شاید وہی بارہ دری والا کنواں۔
چند لمحوں کے بعد اس کے ذہن کی تمام رگیں ایک سکون کے ساتھ سو گئی تھیں۔ اسے محسوس ہوا۔ وہ بے چین سا ایک عرصے سے کمرے میں چلتا رہتا تھا۔ دراصل وہ بارہ دری والے کنویں کا راستہ ڈھونڈتا رہتا تھا۔ اور یہ راستہ کتنا قریب تھا۔ بمشکل سات سو بیس قدم----
آج اس نے تمام قدموں کا شمار کر لیا تھا۔ سات سو بیس---- اور وہ حیران تھا کہ وہ پہلے یہاں کیوں نہیں آیا۔
تبھی تو روز رات کو بیرونی دیوار سے کوئی آواز سنائی دیتی تھی' معلوم نہیں پڑتا تھا کہ وہ کس کی آواز ہے۔ لیکن آج وہ پہچان گیا تھا۔ روز مجھے کاشنی بلاتی

تھی---- سنی بابو---- اس نے آگے بڑھ کر کنویں میں جھانک کر دیکھا- کنویں میں کاشنی کے ہاتھوں کی کانچ کی چوڑیاں چھنکیں وہ اونچی آواز میں چیخا----
کاشنی!!

کئی برسوں کے بعد وہ پہلا دن تھا- جب اس کی آواز ہکلائی ہوئی نہیں تھی- اسے اپنے آپ ہنسی آ گئی اور ایک عجیب سا سکون- جیسے وہ عرصہ کے بعد اپنے گھر لوٹا ہو' اور اس کے گھر اس کی بیوی اور اس کے بچے اس کے انتظار میں ہوں-----

اس نے اپنی دونوں بانہوں کو کاشنی کی طرف پھیلا دیا- آس پاس کے' درختوں نے ایک انسانی چیخ ایسی ہنسی سنی اور اپنے پتوں کی طرح لرزنے لگے-

❀❀❀

ایک گیت کا جنم

روی نے ابھی ابھی ایک نظم لکھنا شروع کی تھی----

لکڑ منڈی سے کالے ٹوپ کی طرف جاتی پگڈنڈی پر چلتے ہوئے اس نے پہاڑی سبزے کو ایک گھونٹ بھر کر پیا تھا- ایک اوک بھر کر پیا تھا' ایک سانس لئے بغیر پیا تھا- کئی میلوں کی چڑھائی کے بعد ڈاک بنگلے میں پہنچ کر جب اس نے سامان رکھا- تو اس کی بیوی نے اس کے لئے گرم گرم کافی بنائی اور اس کے آرام کے لئے پلنگ پر بستر بچھایا تھا- تب اس کو محسوس ہوا کہ وہ آج سو نہیں سکتا- وہ ڈاک بنگلے سے اکیلا باہر نکل آیا- اس کو محسوس ہو رہا تھا جس سبزے کو اس نے گھونٹ بھر کر پیا تھا' اوک بھر کر پیا تھا- سانس لئے بغیر پیا تھا- اسے برداشت کرنا بڑا مشکل تھا- وہ ایک کاغذ لے کر نظم لکھنے لگا- نظم لکھتے ہوئے اسے محسوس ہوا کہ وہ سبزے کے تیز نشے کو اتارنے کے لئے ایک "آنیٹی ڈوٹ" لے رہا ہے-

نظم ابھی مکمل نہیں ہوئی تھی-

ادھوری نظم والے کاغذ کو اس نے گھاس پر رکھ کر اس پر ایک چھوٹا سا تپھر کا ٹکڑا جما کر خود گھاس پر لیٹ گیا-

اسے سارتر کی کہی ہوئی بات یاد آئی- جب لکھتا ہوں' ناامیدی کے جال میں ایک خوبصورتی کو پکڑنے کی کوشش کرتا ہوں- روی کو محسوس ہوا کہ وہ جب بھی نظم لکھتا ہے ناامیدی کے جال میں ایک خوبصورتی کو نہیں پکڑتا- بلکہ ہمیشہ خوبصورتی کے جال میں ایک ناامیدی کو پکڑنے کی کوشش کرتا ہے-

روی نے اپنے دل کو اچھی طرح ٹٹول کر دیکھا- اس میں کوئی ناامیدی نہیں

تھی۔ لیکن اب کاغذ پر لکھی ہوئی نظم میں ناامیدی تھی۔ روی اس سے انکار کر نہ سکا۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ قبروں کی راکھی پر بیٹھا ہوا ہے۔ اس کی محبت کب کی مر چکی ہے۔ محبت کا درد بھی مرچکا ہے۔ وہ اس لڑکی کو نہیں پا سکا۔ جسے اس نے کبھی اپنا سوچا تھا لیکن جب اس نے دلیل کے ساتھ دیکھا تھا تو وہ لڑکی اسے بہت اچھی لگی تھی۔ جس کے ساتھ اس کا بیاہ ہوا تھا۔ اس لئے اس کے دل میں کچھ گم ہونے کا درد نہیں رہا تھا۔ لیکن وہ جس وقت نظم لکھتا تھا۔ نظم میں ایک درد ہوتا تھا۔ لیکن اس درد کو درد نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ یہ درد زندہ نہیں تھا۔ اس لئے آج روی سوچ رہا تھا کہ اس کے اندر کا وہ روی جو نظمیں لکھتا ہے۔ قبروں کا محافظ بنا بیٹھا ہے۔

روی کو پھر سارتر یاد آیا۔ سارتر نے اپنے بارے میں کہا تھا۔ کہ "ہاتھ میں کاغذ لے کر ہر صبح کچھ لکھنے کی دیوانگی کچھ اس طرح تھی۔ جس طرح وہ اپنے زندہ ہونے کی معافی مانگتا تھا۔ روی کو محسوس ہوا۔ یہ بات سچی ہے کیونکہ اس نے آج تک جو کچھ بھی لکھا ہے۔ کبھی اس لڑکی کو پڑھانا نہیں چاہا تھا۔ جس کا وہ اپنی نظموں میں ذکر کرتا تھا۔ اور نہ ہی اس نے اپنی تحریروں سے کوئی شہرت حاصل کرنا چاہی تھی۔ شہر کے بارے اس کا اعتقاد سارتر کے ساتھ ملتا جلتا تھا کہ "شہرت اس وقت آتی ہے جب انسان مرچکا ہوتا ہے اوہ اس کی قبر کو سجانے کے لئے آتی ہے اور جب کبھی انسان کے جیتے جی آجائے تو وہ انسان کو پہلے اپنے ہاتھ سے قتل کرتی ہے پھر اس کی قبر کو سجاتی ہے۔

روی نے اپنی نظموں کو کسی انعامی مقابلے میں نہیں بھیجا تھا۔ اسے اس طرح محسوس ہوتا تھا۔ جیسے کچھ امیر لوگ اپنی امارت کے زور سے عہدوں کے بل پر فن کاروں کی بٹیروں کی طرح لڑا کر دیکھتے ہیں اور پھر ایک دوسرے کو لہولہان کر کے جو جیت جاتا ہے اس کا جلوس نکالتے ہیں۔

روی کو محسوس ہوا وہ جو کچھ لکھتا ہے وہ نہ کسی محبوب کے لئے لکھتا ہے نہ کسی شہرت کے لئے۔ وہ روٹی کھاتا ہے تاکہ زندہ رہ سکے اور وہ نظم لکھتا ہے تاکہ

زندہ رہنے کے قصور کی معافی مانگ سکے۔

روی کو پھر بڑا غلیظ خیال آیا کہ نظمیں کینچوے ہوتی ہیں۔ کینچوے زمین کی گھٹن میں جنم لیتے ہیں اور نظمیں دل کی گھٹن سے

روی کو دراصل اپنا خیال غلیظ نہیں لگا بلکہ اس کو ایک کینچوے کی لجلجاتی اور چپچپی شکل یاد آ گئی تھی۔ اور نظم کے ساتھ اس کا موازنہ کرتے ہوئے محسوس ہوا کہ اس کے خیال کا بدن بھی کینچوے کی طرح چپ چپ کر رہا ہے۔ لیکن بات درست ہے' روی نے سوچا اور ہنسنے لگا۔

روی کو پھر خیال آیا کہ نظم لکھنا تو خدا کی جنت سے سیب چرانے کے برابر ہے آدم نے سیب چرایا تھا۔ تو اس کو جنت سے ہمیشہ کیلئے باہر نکال دیا تھا۔ اس طرح جو بھی انسان نظم لکھتا ہے۔ اس کے دل میں کچھ حصہ چاہے اس دنیا میں رہتا ہے لیکن کچھ حصہ ہمیشہ کے لئے جلاوطن ہو جاتا ہے۔ اور جلاوطن ہوئے دل کا اس دنیا کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

"لیکن نہیں۔" روی نے سوچا۔ "ان دونوں کا ایک دوسرے کے ساتھ نفرت کا تعلق ہوتا ہے۔ دونوں شاید ایک دوسرے پر رشک کرتے ہیں۔ اس لئے دونوں ایک دوسرے کے ساتھ نفرت کرتے ہیں اور اس طرح مسلسل نفرت میں سے ایک خانہ جنگی شروع ہو جاتی ہے۔ نظمیں ایک خانہ جنگی کا اسلحہ ہوتی ہیں اور پھر روی کو ایک بڑی دکھی ہنسی آئی۔ اور نظمیں ہی شاید خانہ جنگی میں لگے ہوئے زخموں کی مرہم ہوتی ہیں!"

نظموں کے اتنے سارے روپ بدلنے کی طاقت ہے۔ روی کو ان کی وسعت کا خیال آیا۔ انسان اس زمین پر کتنی تھوڑی جگہ پر قابض ہو سکتا ہے۔ اس کے گرد اس کے ماحول کی اتنی تنگ جگہ ہوتی ہے کہ وہ کھل کر اپنے ہاتھ پاؤں بھی نہیں ہلا سکتا۔ لیکن روی کی نظم اتنی جگہ گھیر سکتی ہے کہ وہ ایک ہی وقت میں اپنا ایک پاؤں انسان کے پنگھوڑے میں رکھ سکتی ہے۔ اور ایک انسان کی قبر پر۔۔۔۔!!

خیالوں کی ایک ندی بہہ رہی تھی۔ ندی میں کسی برساتی پانی کا سیلاب

نہیں تھا۔ یہ دونوں کناروں کے بندھن کو تسلیم کرتے ہوئے بہہ رہی تھی اور روی اس پانیوں میں مطمئن چلتا جا رہا تھا۔

"ویرا جی۔" آپ کے کاغذ ہوا کے ساتھ اڑ کر بہت دور چلے گئے تھے آپ کو معلوم ہی نہیں ہوا!! مونا نے روی کے پاس آ کر کہا اور کاغذ اس کے قریب رکھ دیئے۔ ہوا تیز ہو گئی تھی۔ مونا نے کاغذ پر رکھنے کے لئے پتھر کا ٹکڑا ڈھونڈنا چاہا لیکن قریب پڑا ہوا پتھر کا ٹکڑا بڑا چھوٹا سا تھا جس سے کاغذ قابو میں نہیں آ رہا تھا۔ مونا نے کاغذ کو اڑنے سے بچانے کے لئے اس پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

شام کے گہرے اندھیرے میں روی نے کاغذ کی طرف دیکھا۔ پھر کاغذ پر پڑے ہوئے مونا کے ہاتھ کی طرف دیکھا۔ جو بہت نازک اور گورا چٹا تھا۔ روی کو محسوس ہوا کہ یہ ہاتھ ایک پیپر ویٹ ہے ایک ہاتھ کو باقی جسم سے الگ کر کے ایک. پیپر ویٹ کی طرح میز پر رکھنے کا خیال روی کو اچھا لگا۔

روی کو پھر یاد آیا۔۔۔۔ کہ ایک دن اس کی بیوی نے اس کے کوٹ کو اپنے کندھوں پر رکھا ہوا تھا تو اس کو خیال آیا تھا وہ کتنا خوبصورت کوٹ ہینگر ہے۔ روی کو ایک حیرانی ہوئی کہ جیتے جاگتے انسانی اعضاء کو وہ ہمیشہ اشیاء کی شکل میں کیوں سوچتا ہے۔ چوڑے گورے اور تنے ہوئے کندھوں کو دیکھ کر اس کو کوٹ ہینگر کا خیال کیوں آتا ہے اور پتلے پتلے گورے ہاتھ کو دیکھ کر اس کو پیپر ویٹ کا خیال کیوں آتا ہے کس کے کندھوں کو ہتھیلیوں میں لے کر ان کے گلے سے لگانے کا خیال اس کو کیوں نہیں آتا۔ اور یہ خیال کیوں نہیں آتا کہ کسی کے ہاتھ کو اوپر اٹھا کر اپنے ہونٹوں پر رکھے۔

روی نے اپنے خیالوں پر زور ڈالا۔ بالکل اس طرح جس طرح بہتی ندی نے کوئی پہاڑ کے الٹ تیرنا چاہے۔ جیتے جاگتے اعضا کو اشیاء کی شکل میں سوچنے سے اس کو گھن آ گئی۔ اسے محسوس ہوا کہ دوسروں کے جسمانی اعضا زندہ ہیں۔ لیکن اس کے اپنے اعضاء میں کچھ مر گیا ہے۔ اس لئے دوسروں کے اعضاء کو چھونے' سونگھنے اور گھٹ گھٹ کر اپنے ساتھ لگانے کا اسے کبھی خیال نہیں آتا۔ روی کے

اپنے اندر جو کچھ مر گیا تھا وہ اسے زندہ کر کے دیکھنا چاہتا ہے' اس نے بڑا زور لگا کر بڑی نظریں بھر کر مونا کے چہرے کی طرف دیکھا۔

چودہ برس کی مونا روی کی بیوی کی چھوٹی بہن تھی۔ لیکن روی کو آج تک یہ ہی محسوس ہوا تھا کہ وہ ایک چھوٹی سی بچی ہے۔ وہ مونا کو ہمیشہ بچوں کی طرح جھڑکتا اور بچوں کی طرح پیار کرتا تھا۔ آج تک روی نے اپنے خیالوں میں اس طرح زور ڈالا۔ جس طرح وہ بہتی ندی میں بہاؤ کی الٹی طرف جا کر دیکھنا چاہتا ہو۔ تب اس کو محسوس ہوا کہ مونا ایک بھرپور لڑکی ہے جوانی نے اس کی چھاتیوں کو بھرا ہوا ہے اور اس کے ہونٹوں پر ایک سرخی چھڑکی ہوئی ہے۔

روی کو محسوس ہوا کہ اس کے دل کا رنگ عرصہ سے پیلا ہو گیا تھا۔ اس پیلے رنگ کو سرخ کرنے کے لئے روی کو خیال آیا کہ وہ مونا کے سرخ رنگ میں ڈوبے ہوئے ہونٹوں کو چوس لے۔

روی کو پہلے کبھی ایسا خیال نہیں آیا تھا۔ اس لئے اسے اس خیال سے دہشت آ گئی---- اور اسے محسوس ہوا کہ لمحہ پہلے وہ خیالوں کی جس چپ چاپ بہتی ندی میں بہہ رہا تھا۔ اس ندی کے پانی میں ایک سانپ تیر رہا ہے۔ یہ دہشت اسے اپنے سے دس بالشت دور چلتے سانپ کو دیکھنے سے ہوئی تھی۔

"ویرا جی" سوئے ہوئے ہو کہ جاگتے؟ مونا کاغذ کے پاس گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی۔ روی نے' آنکھ بھر کر مونا کے چہرے کی طرف دیکھا۔ مونا کا چہرہ اسی طرح معصوم بچوں ایسا تھا۔ جس طرح روی نے ہمیشہ دیکھا تھا۔ جو جوانی کے بھوکے روی کے ساتھ نہ خود جاگ رہا تھا نہ کسی دوسرے کو جگا رہا تھا۔

روی نے دوبارہ نظر بھر کر خیالوں کی بہتی ہوئی ندی کی طرف دیکھا ندی میں کوئی سانپ نہیں چل رہا تھا۔

روی بے خوف ہو کر مونا کے گال پر ایک ہلکی سی چپت لگا کر کہنے لگا "ڈائن! تم یہاں کب سے ہو؟ چل بھاگ یہاں سے۔"

آپ کے کاغذ اڑ کر کہیں سے کہیں چلے گئے تھے۔ اگر میں پکڑ کر نہ لاتی تو

پھر آپ اسے تلاش کرتے سب لکھی لکھائی نظمیں ہوا میں اڑ جاتیں مونا نے غصے سے کہا۔

"اچھا ڈائن' تیرا شکریہ ادا کرتا ہوں' اب تم جاؤ۔ میں ذرا ٹھہر کر آؤں گا۔"

مونا نے روی کی بانہوں کو جھنجھوڑا اور پھر انہیں بانہوں سے اٹھاتے ہوئے کہنے لگی۔ آپ بھی چلیں' دیدی تھک گئی تھیں اس لئے وہ سوئی ہوئی ہیں۔ میں وہاں اکیلی کیا کروں۔"

روی کی باہیں کانپ گئیں۔ بالکل اسی طرح جس طرح ندی میں چلتا سانپ اس کے پاس آکر اس کے ننگے بدن کو چھو رہا ہو۔

روی نے گھبرا کر آنکھیں بند کر لیں۔ مونا کا سانس روی کے ماتھے کو چھو رہا تھا۔ روی کے بدن میں ایک گرم سی لہر چل رہی تھی اور پھر روی کو محسوس ہوا کہ اس نے مونا کو کھینچ کر اپنے سینے سے لگا لیا ہے۔ مونا کے ملائم اور بھرے بھرے ابھار پر روی کی ہتھیلی کانپ رہی تھی۔

مونا کے پتلے پتلے ہونٹوں کو چھو کر روی کے بھارے اور مردانہ ہونٹ کانپ رہے تھے اسے محسوس ہوا کہ ندی میں تیرتا ہوا سانپ اس کے بدن کو چھو کر گزرا نہیں بلکہ اس کے بدن کو ڈس کر گزرا ہے۔ جس سے اس کا بدن آگ کی طرح جل رہا ہے۔

"ویرا جی' آپ کو کیا ہو گیا ہے۔ آپ پھر سو گئے۔" مونا نے انجانے سے کہا اور اپنی انگلیوں کی پوروں سے روی کی بند ہوتی آنکھوں کو زبردستی کھولنے لگی۔

روی پر ایک مدہوشی کا عالم تھا۔ اس کے کانوں میں سائیں سائیں ہو رہی تھی۔ اس کو باہر سے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ جو کچھ سنائی دے رہا تھا وہ اسے اپنے اندر سے سنائی دے رہا تھا۔ اس کا اندر اسے کہہ رہا تھا کہ اسے سانپ کے ڈسنے کا زہر چڑھ رہا ہے اس چڑھتے ہوئے زہر کے ساتھ روی کو محسوس ہوا کہ اس نے مونا کی قمیص کو پھاڑ کر اس کے گلے سے اتار دیا ہے اور اب مونا کا بدن اندھیرے میں ایک سفید سی ڈھلی کی طرح چمک رہا ہے اور روی کی آنکھوں میں

مونا کے ننگے بدن کا رنگ اتنا چمکنے لگا کہ اس کی آنکھیں چندھیا گئیں۔

چندھیائی آنکھوں سے روی نے دیکھا۔ اب سانپ کا زہر اس میں اتنا سرایت کر گیا تھا کہ اس کا سارا بدن تن گیا ہے۔

روی کے حواس اب بھی کام کر رہے تھے۔ بالکل اسی طرح جس طرح کوئی اپنی موت کے عمل کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہو۔ اس کے اعضا لحہ بہ لحہ تن رہے تھے اور سوزش بڑھ رہی تھی وہ تڑپ بھی رہا تھا اور اپنے آپ کو تڑپتا ہوا دیکھ بھی رہا تھا۔ تڑپنے والے روی کے دل میں ایک بے بسی تھی اور تڑپتا دیکھنے والے روی کے من میں ایک خوف تھا۔ ایک روی نے مونا کی طرف للچاتی نظروں سے دیکھا۔ دوسرے روی نے ہاتھ کے اشارے سے اسے کہا کہ وہ یہاں سے چلی جائے۔

مونا کو کچھ سجھائی نہ دے رہا تھا لیکن اس نے روی کے ہاتھ کے اشارے کو مان لیا اور نظم والے کاغذ کو اس کی بانہوں کے نیچے رکھ کر وہاں سے چل دی۔

روی نے گھبرا کر مونا کو آواز دینا چاہا کہ وہ ٹھہر جائے لیکن روی کے اپنے گلے نے ہی اپنی و آاز کو دبا دیا۔ تھکے ماندے روی نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

خیالوں کی ندی اسی طرح دونوں کناروں کے بندھن کو تسلیم کرتی چپ چاپ بہہ رہی تھی۔ روی نے اپنے آپ کو ندی کے حوالے کر دیا۔ ٹھنڈے پانی کے لمس کی طرح روی کو خیال آیا کہ ایک فلاسفر نے کہیں لکھا تھا کہ تمہیں جینا پڑے گا۔ کیونکہ زندگی کو تسلیم کرنے سے انکار کیا جا سکتا ہے اور روی کو خیال آیا کہ یہ سارا فلسفہ بے بسی کا فلسفہ ہے انسان کچھ نہیں کر سکتا بلکہ زندگی کو تسلیم کرنے سے پہلے انکار کرنے کے لئے اپنے ہونٹ بھی نہیں ہلا سکتا؟

روی نے اپنے ہونٹ ہلانا چاہے۔ لیکن ندی کے ٹھنڈے پانی کے ساتھ اس کے ہونٹ اتنے بے حس ہو رہے تھے کہ وہ حرکت نہیں کر پاتے تھے۔ روی کو خیال آیا کہ وہ ایک عام سا کمزور آدمی ہے۔ اس نے محبت کا تاریخی ہیرو بننا چاہا تھا لیکن وہ ہیرو نہ بن سکا۔ اس نے الم ناک عاشق بننا چاہا لیکن وہ خستہ حال عاشق بھی

نہ بن سکا۔ وہ ایک سیدھا سادہ کمزور سا آدمی ہے۔ وہ آدمی جس کے ہونٹ نہ اقرار کر سکتے ہوں نہ انکار۔ پھر روی کو خیال آیا کہ وہ اپنے ہونٹ نہیں ہلا سکتا۔ وہ صرف یہ کر سکتا ہے کہ وہ اسے ایک نظم کی خوبصورتی کا جال بن کر ان بند ہونٹوں کی ناامیدی کو پکڑ سکتا ہے۔ اس نے تڑپ کر ہاتھ میں قلم پکڑا اور بازو کے نیچے پڑے ہوئے کاغذ پر جلدی سے کچھ سطریں لکھیں۔

نظم مکمل ہوئی۔ روی اتنا تھک گیا تھا جیسے خیالوں کی ندی میں تیرتے تیرتے اس کے سارے اعضاء نڈھال ہو گئے ہوں ندی اب بھی دونوں کناروں کے بندھن کو تسلیم کرتے ہوئے چپ چاپ بہہ رہی تھی اور ندی میں تیرتا ہوا سانپ جو روی نے دیکھا تھا وہ اب کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اب روی کے دل میں خوف نہیں تھا' صرف تھکاوٹ تھی۔

روی کو محسوس ہوا کہ اس کو سردی لگ رہی ہے۔ ندی کا پانی لحہ بہ لحہ اور ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ اس نے کنارے کو چھوا اور اپنے بدن پر خیالوں کے نچڑتے پانی کو پونچھتا ہوا جلدی جلدی ڈاک بنگلے کی طرف چل دیا۔

روی کی نظم نے اس کے بدن کا سارا زہر چوس لیا تھا۔ اب اس کے اعضا پرسکون تھے' صرف تھکاوٹ تھی جس سے وہ سردی کو محسوس کر رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ وہ جلدی جلدی قدم اٹھائے اور اپنی بیوی کے گرم بستر میں جا کر سو جائے۔